Comp

روزنامچہ

(بعد نظر ثانی اور اضافہ)

قاضی عبدالغفار

عبدالحق اکیڈمی

اشاعت منزل کوچۂ عبدالحق حیدرآباد (دکن)

(مجنوں کی ڈائری)

جنوری ۱۹۴۶ء

تعداد طبع .... ایک ہزار

قیمت .... عـہ

کلمۂ ناشر

قاضی عبدالغفار صاحب ہماری زبان کے مسلم ادیب ہیں اور اُن کی مقبول ترین کتابوں میں سے ایک کتاب "روزنامچہ" ہے۔ یہ وہی کتاب ہے جو بدمذاق ناشرین کی بدمذاقی سے مجنوں کی ڈائری بن کر مدتوں سے بازار میں فروخت ہو رہی ہے۔ قاضی صاحب کو بجا طور پر ناشروں سے یہ گلہ ہے کہ انھوں نے "لیلیٰ کے خطوط" کے جواب میں قاضی صاحب کے ادبی شہکار کو "مجنوں کی ڈائری" بنا تو ڈالا مگر بدمذاقی کا بُرا ہو کہ یہ الفاظ ادب ناشناس کے دماغ کی پیداوار ہونے پر خود ہی شاہد ہیں۔

اب جب کہ قاضی صاحب نے پوری کتاب پر نظر ثانی کر کے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے اور نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول کی ناقابلِ انکار شہادت بن کر یہ کتاب نظر فروز ہو رہی ہے تو اسے اپنے اصلی نام "روزنامچہ" سے شایع کیا جا رہا ہے۔ قاضی صاحب نے اس پر بڑی توجہ کے ساتھ نظر ثانی کی ہے اور حق یہ ہے کہ اسے اب بالکل جدید چیز بنا دیا ہے۔

جدید تمدن ہماری نئی نسلوں پر جس طرح مسلط ہو رہا ہے اور تہذیبی

"روزنامچہ" کا روزنامچہ نگار ہے۔ اس کے ہاتھوں سے قاضی صاحب
نے خود اُس کی جو سچی تصویر کھنچوائی ہے وہ قاضی صاحب جیسے پختہ مشق
ادیب ہی کا حصّہ ہوسکتا ہے۔ قاضی صاحب کی باریک بین نظر نے ایک
خوش حال اور بے فکر نوجوان کے ذہن و دماغ کی جن باریک سے باریک
لکیروں کو دیکھا اور ان کا جتنا واضح عکس اس کتاب میں پیش کیا ہے، اس
کی داد دینے سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان انھیں غور
سے دیکھیں اور خود اپنے دل و دماغ کو ایسے تباہ کن نقوش سے محفوظ رکھنے کی سعی
کریں اور یہ سمجھیں کہ جوانی کو اخلاقیات کی قید و بند سے آزاد کرکے حسن کے شبستانوں
اور شباب کے گلستانوں میں اس طرح بے مہار دوڑانا کہ پھولوں کی کیاریاں تباہ
ہو جائیں اور زندگی کے سبزہ زار ویرانوں میں بدل جائیں، جوانی کی سب سے
بڑی بے قدری ہے۔ اور طاقت کا وہ مصرف ہے جو نہ صرف دوسروں کے لیے
تباہ کن ہے بلکہ خود طاقت کے لیے بھی موت کا حکم رکھتا ہے۔

اگر ایک نوجوان نے بھی ان اوراق کو پڑھ کر اور اسے سمجھ کر اپنے دل و
دماغ کو محفوظ رکھنے کی سعی کی تو مصنّف کی محنت ٹھکانے لگی اور ناشر کی کاوشیں کام
آئیں اور آپ یقین فرمائیں کہ اس کتاب کی اشاعت سے کاروباری اور تجارتی منافع کی
امید کے ساتھ ساتھ یہ بھی مقصود ہے۔ ورنہ آج کل سامان طباعت کی اس نایابی کسی
کتاب کی اشاعت کا عزم اتنا آسان نہیں کہ صرف تجارتی منافع کا موہوم تصور اس کے
لیے کار آمد ہوسکے۔ — راشد اکرم

ماضی

متاعِ رفتہ ہے ——— اُس کا غم کیا؟

حال

رفتنی اور گذشتنی ہے ——— اُس کا فکر کیا؟

اِستقبال

کا تخیل زندگی ہے! ——— اُسی کی طرف میری کاغذ کی کشتی رواں ہے!

شرحِ کلام

جس زمانہ میں "لیلیٰ" کے خطوط شایع ہو رہے تھے اور پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ اُن کو پڑھ رہے تھے، میرے اکثر احباب نے مجھے اس امر پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا کہ "لیلیٰ" کا طرزِ بیان بہت بے حجاب ہے اور اعتدال کی حد سے گزرا ہوا۔ بعض نے تو یہ بھی کہا کہ "لیلیٰ" کی یہ جسارت کہ وہ مذہب اور انسانیت کے بہترین مسلّمات سے کھیلتی ہے اور مذہب کی سنجیدگی کے ساتھ شوخیاں کرتی ہے، قطعاً ناروا ہے۔ میں نے اِن احباب سے جو کچھ عرض کیا تھا وہی اب عرض کرتا ہوں یعنی :۔

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر!

رات کے ہاتھ میں ایک کاسۂ دریوزہ گری

یہ چمکتے ہوئے تارے!

یہ دمکتا ہوا چاند!

بھیک کے نور میں مانگے کے اُجالے میں مگن

یہی ملبوس عروسی ہے یہی اون کا کفن!

....

رات کے پاس اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہیں!

(مخدوم محی الدین)

"لیلیٰ کے خطوط" میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا اُس کے لیے موزوں طرزِ بیان وہی تھا جو "لیلیٰ" نے اختیار کیا۔ عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہ تھا۔ لامحالہ ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقایق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرزِ بیان بے اثر اور بے معنی کر دیتا۔ جو نوکِ خار میں چاہتا تھا کہ اُن موٹی کھالوں میں چبھے جن پر معمولی چٹکیوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا اُس نوکِ خار کو سنجیدگی اور اعتدالِ بیان کی کم اثری سے میں اگر کند کردوں تو اس داستان کی روح باقی نہ رہے۔ درحقیقت میں مجبور تھا کہ "لیلیٰ" کے قلم کی نوک سے اُن موٹی اور سخت کھالوں میں سوراخ کراؤں! اپنے مقصد میں کس حد تک مجھے کامیابی ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جنھوں نے "لیلیٰ کے خطوط" کو محض ان کی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں پڑھا بلکہ ان خطوط کی مہجور روح کو بھی دیکھا ہے جو "لیلیٰ" کے قلم کی روانی میں مری ساری داستان گوئی کا ماحصل تھا۔ عورت کے خونچگان کفن کے وہ چند دھبے جس مقصد کے تحت پیش کیے گئے تھے ویسا ہی

ایک مقصد اس روزنامچہ کے اوراق میں مضمر ہے۔

یہ روزنامچہ ایک قلمی تصویر ہے جس میں عہد جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے چند پہلو پیدا کیے گئے ہیں۔ محض ادبی نقّاشی نہ "لیلیٰ کے خطوط" کا مقصد تھا نہ "روزنامچہ" کا ہے۔ پس جو لوگ سطحی طور پر ان اوراق کی ادبی خوبیوں کی داد دیں اور ان نقوش کی معنوی اہمیّت پر نظر نہ کریں، ان کی طرف سے مجھے داد ملی بھی تو کیا ـــــ میرے نزدیک وہ "تحسین ناشناس" ہے!

اگر میرے ادّعا کو خود بینی پر محمول نہ کیا جائے تو اتنا ضرور عرض کروں کہ "روزنامچہ" کا ایک حرف بھی محض زور قلم کا مظاہرہ کرنے کے لیے نہیں لکھا گیا۔ میرا یہ "روزنامچہ نگار" ایک تعلیم یافتہ اور دولتمند نوجوان ہے۔ زمانہ بھر کا نیے فکرا، ہر حال میں وہ ـــــ روتے ہوئے، ہنستے ہوئے، بگڑتے ہوئے، جھنجھلاتے ہوئے، غصّہ میں، مرتے ہوئے، عشق میں، عیّاشی میں، مئے نوشی میں، یاروں کی صحبت میں، بمبئی کے کیٹم خانوں میں، تنہائی کی راتوں میں، وصل کی شب میں،

اختر سے گفتگو یا مولانا یا میر صاحب سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے ــــــ ہر حال میں جو کچھ لکھتا ہے، جو نقش بھی کاغذ پر بناتا ہے، وہ ہر نقش اس کی زندگی کے لنگر کی شکست کا ردِعمل ہے ــــــ ایک بےچین اور غیر متوازن فطرت کی متلاطم کیفیات کا جنھوں نے اس کی زندگی کا لنگر توڑ دیا ہے۔ مختصر یہ کہ ان اوراق کی چادر میں زندگی کے چند مقاصد اور حقایق ہیں جو لپیٹے ہوئے ہیں۔

ایک ایسے انسان کی زندگی کی معنوی حقیقت بیان کرنے کے لیے جس نے مذہب، اخلاق اور جذبات کی تمام حدود کو توڑ ڈالا ہو طرزِ بیان بھی زہد خشک کی حدود کے اندر محدود نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات کلام کی سنجیدگی بھی مطالب کا خون کر دیتی ہے اور اکثر مشاہدہ حق کے لیے بادہ وساغر کی بےحجابیاں ناگزیر ہوتی ہیں۔

اس تمہید کے بعد چند الفاظ میں عرض کر دوں کہ میرا موضوع ہے کیا۔ دَورِ جدید کا وہ نوجوان جو تعلیم یافتہ کہا جاتا ہے اور جو زندگی کی کشمکش سے فارغ رہ کر اپنے جذبات اور محسوسات کی زنجیریں توڑ دیتا ہے۔ نئے ہندوستان کی نئی تعلیم و تربیت کی

پیداوار۔ یہ ناقص پیداوار ہمہ تن ایک جہل مرکب ہے جو زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر ہو کر اپنے لیے جہل مطلق کی ایک نئی دُنیا بسا لیتا ہے۔ اس بے علمی کے ساتھ جس کا نام ہمارے ملک میں "تعلیم" رکھا گیا ہے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی جاتی ہے، اس کا توازن فنا اور اس کی زندگی میں ایک خوفناک انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ صحیح تربیت کے بغیر ایک ایسی تعلیم جو مغرب و مشرق کے بہت سے علوم کا ایک نامکمل اور غیر مرتب مرکب ہو یا تو ایسے جانور پیدا کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی کماتے ہیں اور مر جاتے ہیں یا ایسے نوجوان پیدا کرتی ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے برگشتہ ہو کر زندگی کا مقصد صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ ادنیٰ جذبات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں اور جوانی کے گرم خون کو اور بھی زیادہ گرم ہو کر دوڑنے دیں۔ وہ خود داعیان مذہب کی لا مذہبی اور مذہب ناشناسی اور نفس پروری کے مظاہرے دیکھتے ہیں اور اپنی نفسیات سے جو کچھ حاصل کر سکتے ہیں وہ صرف مذہب کے خلاف نفرت کا ایک جذبہ ہوتا ہے۔

"حاملانِ شریعت حقہ"، کو اس حقیقت کا کچھ علم نہیں کہ مسلمانوں کی اُس نسل میں جو تیرہ سو ۱۳۰۰ برس پہلے پیدا ہوئی تھی

اور اس نسل میں جواب پیدا ہو رہی ہے اور دُنیا کے انقلابات کی گود میں پرورش پا رہی ہے کس قدر فرق اور بُعد ہے۔ وہ کہتے ہیں ——— ہمارے یہ مذہبی پیشوا ——— کہ جب کتاب میں لکھنے والا یوں لکھ گیا تو پھر یوں ہی صحیح ہے! وہ کتاب چھ سو برس پہلے لکھی گئی ہو یا نوسو برس پہلے تاہم اس کا "حکم" زمانہ کے فصل و بُعد پر یکساں حاوی ہے اور حاوی رہے گا! اجتہادات کا دروازہ بند ہے! ایک مسجد کے ٹوٹے ہوئے لوٹے کے متعلق بھی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا! دُنیا کچھ سے کچھ ہو جائے، عقل اور سائنس کی طاقتیں انسانوں کو مشین بنا دیں اور زندگی کا سارا نقشہ بدل ڈالیں، لیکن علمائے قدیم نے جو لکھا ہے وہی لکھا رہے گا! اور جو کچھ اِن حاملان شریعت حقہ نے مدرسہ میں پڑھا تھا وہ پتھر کی لکیر بنا رہیگا۔ مگر نوجوانوں کے سامنے زندگی کے نئے نئے حقایق مغرب کی تعلیم پیش کر رہی ہے، وہ اُن حقایق کو سمجھے بغیر قبول کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دھوبی کے کتے بن کر نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ روٹی اور پیٹ کا سوال اُن کے راستہ میں حایل ہوتا ہے تو وہ اُسی میں پھنس کر رہ جاتے ہیں اور اگر ان میں سے دو چار کو باپ دادا کی کچھ دولت ہاتھ آتی ہے تو اُس کی حالت وہ ہوتی ہے

جو میرے اس "روزنامچہ نگار" کی ہے۔ جب تک اہل مذہب کی خود فریبیاں اور خود مختاریاں بے لگام رہیں گی نوجوانوں کے یہ کشتیاں یک ایسے متلاطم سمندر کی ہواؤں اور موجوں کے حوالہ ہوتی رہیں گی جس کی سطح پر بڑے بڑے بادبان روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے رہتے ہیں۔ مغربی تعلیم ان نوجوانوں کو بی۔اے یا ایم۔اے اور ڈاکٹر اور علاّمہ تو بنا دیگی مگر انسان نہیں بنا سکتی۔ سب کچھ اس تعلیم سے حاصل ہوتا ہے سوائے علم کے! چند صفحے تاریخ کے —— وہ بھی اپنی نہیں —— چند صفحے جغرافیہ کے، چند قاعدے ریاضی کے، چند مبادی سائنس کے، دو ایک کتابیں انگریزی ادب کی۔ ایک دو رسالے اردو فارسی یا ہندی کے ——۔ یہ نسخہ ہے "کوفتہ بیختہ آمیختہ بتوشند"! اس نسخہ کی دوائیں معدے سے حلق تک بھری جاتی ہیں پھر ان نوجوانوں کو ایک سیاہ چُغہ کاندھوں پر ڈالنے کے لیے، ایک سیاہ مثلث سر پر رکھنے کے لیے عطا کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کی کشاکش کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ نئے سپاہی تیار ہوتے ہیں! قصور کس کا ہے؟ کسی کا ہو، مگر اِن غریب نوجوانوں کا تو یقیناً نہیں ہے جن کو کالجوں میں اس طرح پیسا، گھولا اور چھانا جاتا ہے کہ

جب وہ کالجوں اور اسکولوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو اُن کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا، ان کا دماغ معطل ہوتا ہے اور کمر دوہری! پھر وہ دونوں طرف سے ٹھوکریں کھاتے ہیں، مذہب والے ان کو ملعون و مردود کہہ کر دھتکارتے ہیں اور دُنیا والے ان کو دو وقت کی روٹی کمانے نہیں دیتے۔ ہر طرف سے تنگ آکر وہ یا تو مذہب والوں کی خامیوں کو مذہب کے خشک تصوّرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور دہریہ اور منکر ہو جاتے ہیں، یا تعلیم دینے والوں کے تمام عیوب کو علم سے منسوب کر کے معاشیات و اقتصادیات کے موجودہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں اور شوشلزم کے جھنڈے کے نیچے زندگی کا ایک نیا نقشہ بنانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں۔ مگر جن کو ذرا سی بھی راحت جسم و جان کا کوئی وسیلہ حاصل ہوتا ہے وہ مذہب اور دُنیا کی تمام مسلمہ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر بے تکلّف اپنے تمام اضطراری جذبات کی کارفرمائی کو زندگی کا مقصود قرار دے لیتے ہیں اور یوں اِس انتہا پر یا اُس انتہا پر اپنی زندگی کو ختم کرتے ہیں!

اِن اوراق میں جو نقوش پیش کیے جا رہے ہیں وہ ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک نوجوان کی معنوی زندگی کا

عکس ہیں۔ ایک خاص نکتہ جو توجہ کے قابل ہے شخصی اجتہاد کا وہ غلبہ ہے جو "روزنامچہ نگار" کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں اور معیار کا پابند ہونا گوارا نہیں کرتا زندگی کے ہر شعبہ میں، سیاست ہو یا اخلاق، یا مذہب، وہ اپنے لیے اپنے ہی معیار پر ہر چیز کو جانچتا ہے اور کچھ پروا نہیں کرتا کہ دُنیا کیا کہے گی، یہ اس کا بے خوف، آزاد اور غیر متوازن اجتہاد اس کو ہر سمت میں دَوڑاتا ہے اور کسی سمت میں قرار نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنے نفس کو ہر پابندی سے آزاد اور اپنی ہر خواہش کو بے لگام رکھنا چاہتا ہے، وہ دُنیا سے ہر بہتر چیز اپنے لیے حاصل کرنا چاہتا ہے، مگر دینا کچھ نہیں چاہتا، کامیاب ہونا چاہتا ہے بغیر کوشش کے۔ اُڑنا چاہتا ہے بغیر پَروں کے، اور جب بہت سے امکانات غیر ممکن ثابت ہوتے ہیں تو جھلاّتا ہے، بگڑتا ہے، اور کدال لے کر کبھی مذہب کے محراب و منبر پر حملہ کرتا ہے، کبھی تمدّن کے میناروں پر یُورش! قصور اُس کا نہیں! قصور زندگی کے اُن سانچوں کا ہے جن میں یہ نوجوان ڈھالے جا رہے ہیں۔ سچ پوچھیے تو یہ غریب اپنی زندگی کی کشاکش کے ایک عذاب الیم میں مبتلا ہے!! اپنی مجبوریوں کو محسوس کر کے وہ موت کا بھی مقابلہ

کرنا چاہتا ہے اور خودکشی کا ایک نیا فلسفہ پیش کرکے موت کے مقابلہ میں اپنی آزادی اور خودمختاری ثابت کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے ـــــ اگر وہ زندگی کی قدامت کے خلاف اعلانِ جنگ اور اعلانِ بغاوت نہ کرتا پھرے تو کیا کرے۔ کم نظر اُس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ صرف اُس کا ظاہر دیکھتے ہیں۔ اس کے باطن کو نہیں دیکھتے، اُن طوفانوں کو نہیں دیکھتے جو اس کے اندر برپا رہتے ہیں!

اگر آپ اِن اوراق کو پڑھتے وقت بین السطور بھی دیکھتے جائیں گے تو آپ بہ آسانی معلوم کر سکیں گے کہ باوجود اس بغاوت کے جس کا عَلَم یہ باغی بلند کیے ہوئے ہے۔کبھی کبھی جوہرِ اصلی کی ایک جھلک اس کی زندگی میں نظر آتی ہے۔ جس طرح شب کی تاریکی میں، اور جنگل کے کسی تاریک کونے میں ایک کرمکِ شب چراغ کی چمک! مثلاً عورت کے متعلق وہ شدت کے ساتھ اپنی خود غرضانہ نفس پرستی کا اعلان کرتا ہے، لیکن اپنی تمام عیّاشی اور عیش پرستی میں جب کبھی محبت کی ایک لرزش اس کے اندر پیدا ہوتی ہے تو وہ دُنیا کا باغی ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے اور اپنے میدانِ جنگ میں بڑھتے بڑھتے یکایک رک جاتا ہے۔ نفس کی اُس

خود مختاری کے زرہ بکتر کے نیچے ایک کمزور نقطہ موجود ہے!! جوہر اصلی کی ایک چنگاری باقی ہے جو دل کے کسی تاریک گوشہ میں دبی پڑی ہے! لیکن "مذہب" کے ٹھیکیدار ایک طرف اور "عقل" کے علم بردار دوسری طرف ——

دونوں میں سے کوئی اس چنگاری کے وجود کی پروا نہیں کرتا بلکہ محض سطح کو دیکھ کر فیصلے اور فتوے صادر فرماتے ہیں۔ طبیب بخار کا علاج کرتا ہے اور دن میں چار چار دفعہ نسخے بدلتا ہے لیکن وہ بخار جن اسباب کا محض ایک ظاہری نتیجہ ہے ان کی جستجو نہ کرتا ہے نہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے پھر جب مریض کو کسی طرح شفا نہیں ہوتی تو بہت حیران ہوتا ہے کہ یہ بات کیا ہے! اپنی بدعقلی کا اسے خیال بھی نہیں آتا، الزام رکھتا ہے مریض پر!!

مجھے کچھ زیادہ امید نہیں کہ میرے یہ اشارے سونے والوں کے حلق میں گھس کر ان کے خراٹوں کو بند کر سکیں گے، لیکن اگر سننے والوں کے کان بہٹے ہوں تو اس کے کبھی یہ معنی نہیں ہو سکتے کہ بولنے والوں اور کہنے والوں کی زبان بھی گنگ ہو جائے! ابھی تو اس گفتگو کا آغاز ہے۔ "لیلیٰ" کے

خطوط" اور "روزنامچہ" کی داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کے آئندہ اقساط میں پیش کی جائیگی۔

حیدرآباد دکن
۱۲ر جولائی ۱۹۳۴ء

عبدالغفار

"لیلیٰ کے خطوط" میں سماج کے بعض گوشوں کی تصویر میں نے کھینچی ہے اُسی تصویر کو دیکھنے کا یہ ایک دوسرا زاویہ نظر ہے جس کی میں نے "روز نامچہ" کے اوراق پر نشان دہی کی ہے ——

اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میری اس کتاب کے یا "لیلیٰ کے خطوط" کے کتنے ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں اور کس کس نے اُن کو شایع کیا ہے اور کہاں سے کہاں وہ شایع ہوئے ہیں تو یقین جانیئے کہ میں نہیں بتا سکتا! جہاں تک مجھے معلوم ہے "لیلیٰ کے خطوط" کے آٹھ یا نو ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ اس "روز نامچہ" کے بھی

پانچ یا چھ ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔ لیکن مجھ سے
قسم لیجیے اگر میں نے اُن کی صورت بھی دیکھی ہو یا
مجھے یہ معلوم ہو کہ کن ناشر صاحب نے کب میرے
حال پر یہ عنایت فرمائی! پنجاب کی مردم خیز سرزمین
پر سر سید کے زمانہ کے "زندہ دلان پنجاب" کی تجارتی
اخلاقیات کا یہ ایک نیا زاویہ ہے جس سے مجھے "لیلیٰ کے
خطوط" لکھنے کے بعد انشراح قلب حاصل ہوا!! ——
بہر حال اب تو ان دو کتابوں —— اور شاید
میری بعض دوسری کتابوں کی اشاعت کا بھی یہ عالم
ہے کہ :-

اُڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ بلبل نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

اپنی ہی کتابوں کی نشر و اشاعت سے میری بے خبری
کچھ ایسی ہے کہ گویا یہ کتابیں کسی اور نے لکھی تھیں،
میں نے کبھی لکھی ہی نہ تھیں!! —— سنتا ہوں کہ
"حق تصنیف" بھی کسی صوفی پیر کے ضمیر روشن کی
طرح سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا چلا آتا ہے! مجھے خبر نہیں کہ
آج کل اس ناقۂ لیلیٰ کی نکیل کس کتاب فروش شتربان کے

ہاتھ میں ہے!

ناشرین کی بے نیازی دیکھی کہ مصنّف اور ناشر کے
درمیان وہ جو ایک معمولی رسم اخلاق ہوا کرتی ہے میں
اُس سے بھی محروم رہ گیا!

اب اس "روزنامچہ" کا یہ کونسا ایڈیشن ہے مجھے
بالکل معلوم نہیں! ——— لیکن اس کتاب کے متعلق
ایک بڑا ظلم جو مجھ پر میرے پہلے ناشر [illegible] کیا اُس کا ذکر
کرنا ضروری ہے۔ میں نے ان اوراق [illegible] عنوان صرف
"روزنامچہ" قرار دیا تھا۔ ناشر صاحب نے اُس میں
اپنی طرف سے "مجنوں [illegible] [illegible] ہی گھٹیا دُم
——— بہت ہی بھونڈا [illegible] اور [illegible] ——— دُم چھلا
لگا دیا! جب پہلی دفعہ وہ سرورق سامنے دیکھا [illegible] یہ
"مجنوں کی ڈائری" [illegible]
نے [illegible] فرمایا ہے تو [illegible] کہ دیکھ کر اپنے اُوپر
لعنت بھیجی کہ یہ روزنامچہ میں نے لکھا ہی کیوں اور
لکھا بھی تو جناب ناشر کے حوالے کیوں کیا! ———
میری اس مظلومیت میں [illegible] مجنوں [illegible]

اُس کے باپ دادا نے بھی کبھی "ڈائری" کا نام نہ سنا تھا! ناشر صاحب نے اول تو "لیلیٰ" سے جوڑ ملانے کے لیے ایک مجنوں پیدا کیا اس کے بعد میاں مجنوں پولیس کے تھانہ میں "داروغہ جی" بن کر ڈائری لکھنے لگے!

——— غرض یہ کہ ناشر صاحب نے کتاب کا یہ نام تجویز کر کے میرے افکار کو اس قدر مجروح اور مسخ کر دیا کہ میں خود یہ سمجھنے لگا کہ "لیلیٰ کے خطوط" کے ساتھ یہ روزنامچہ ایک ادنیٰ درجہ کی کتاب ہے۔ متعدد ناقدین نے بھی ——— غالباً اس بدنصیب نام کی غیر شاعرانہ ترکیب سے متاثر ہو کر ——— اپنا یہی خیال ظاہر کیا کہ یہ کتاب ایسی ہے جیسے اُس رنگترے کا پھوکس جس کا عرق پہلے ہی نکال لیا گیا ہو!!

لیکن دس سال بعد اب جو میں نے نظر ثانی کرتے ہوئے پھر ایک دفعہ ان اوراق کو پڑھا تو میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ "روزنامچہ" کے ناقدین کی رائے حقیقتاً صحیح نہ تھی اور یہ کہ "روزنامچہ" اور "خطوط" دونوں میرے ادب اور تخیل کی تقریباً ایک ہی سطح پر ہیں اُن میں اگر کچھ فرق ہے تو صرف نادیہ نظر کا۔ البتہ "روزنامچہ" کے

نقش ونگار چونکہ ایک مرد کے قلم سے بنوائے گئے ہیں
اس لیے شاید اُن میں پڑھنے والوں کے لیے وہ کشش
نہیں جو لیلیٰ کے لکھے ہوئے خطوط میں ہے! علاوہ بریں
"روزنامچہ" میں جو طنز ایک مرد نے خود اپنی حالت
پر کیا ہے وہ بھی شاید اُس کے ہم جنسوں کی جنسی عصبیت
پر گراں گزرا ہوگا! مرد اپنے عیوب کو عورت کی زبان
سے سنا تو گوارا کر لیتا ہے ـــــ اس لیے کہ رسم وراہ
حسن پرستی کے مطابق اُس کی نظر میں یہ بھی عورت کی
ایک ادائے ناز ہے اور مرد کا تقاضائے نیاز! ـــــ
لیکن خود اپنی معزز جنس کی کوئی ایسی تصویر جو خود اُسی کی
جنس نے کھینچی ہو وہ ہرگز پسند نہیں کر سکتا۔ ایسی
تصویروں سے اُس کی جنسی عزت خراب ہوتی ہے!
ـــــ وہ اپنی بلند مقام پر جنس کی عزت ونشست کا
بہت ہی سخت اور شدید محافظ ہے!

غرض یہ کہ بعض ناقدین نے "روزنامچہ" کو
"خطوط" کے مقابلہ میں بہت "پھیکا" قرار دیا تھا لیکن
اب جو میں نے ان اوراق کو ایک دفعہ پھر پڑھا تو میرا
اپنا گمان یہ ہے کہ ناقدین کی رائے صحیح نہیں۔ جدید تمدن

ہماری نئی نسلوں کو جس سانچے میں ڈھال رہا ہے اور
جس نام نہاد تہذیبی ارتقاء کے سیلاب میں ہم سب بہے
جا رہے ہیں اُسی کی پیداوار ——— کسی قدر مبالغہ کے
ساتھ ——— میرا یہ روزنامچہ نگار ہے۔ میں اُس کے
کردار کا صحیح عکس کس حد تک ان صفحات پر پیش کر سکا،
اور کس حد تک اس مقصد کی تکمیل سے قاصر رہا، اس
بات کا فیصلہ میں نہیں کر سکتا۔ "روزنامچہ" کے ناقدین
ہی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ اپنی جنسی عصبیت اور احساسِ
تفوق سے قطع نظر کر کے اُس بے فکرے نوجوان کے تاثرات
کا مطالعہ کریں جو میرے صفحات پر تہذیب اور اخلاق کے
مسلمہ اصولوں سے دیوانہ وار کھیل رہا ہے! وہ اپنی جوانی
——— باغی جوانی ——— کو قدیم اخلاقیات کے قید و بند
سے آزاد کر کے حسن کے شبستانوں اور گلستانوں میں اس
طرح دوڑا رہا ہے کہ پھولوں کی کیاریاں برباد ہو جائیں،
زندگی کے سبزہ زار کچلے جائیں، صحن چمن کے تختے برباد
ہو جائیں، مگر وہ سمجھتا ہے کہ گل گشت اسی کو کہتے ہیں!
——— طاقت کے غرور کے بغیر جوانی محض بے معنی ہے!
ہندوستان کی خوشحال یعنی سیاسی اصطلاح میں

"سرمایہ دار" نئی نسل کی ان کیفیات کا آئینہ ہیں نے "روزنامچہ" کے صفحات کو بنایا ہے تاکہ ہندوستان کے بڑے گھروں اور "سوسائٹی" کے اونچے مقاموں پر ایک ادنیٰ انسانیت کے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں اُن کی ——— ایک مثال لفظوں کے اس تصویر میں پیش کر دی جائے۔ میری یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوئی میں نہیں کہہ سکتا لیکن جو لوگ "روزنامچہ" کی ادبی حیثیت کو "خطوط" کے مقابلہ میں کمتر سمجھتے ہیں وہ ایک دفعہ پھر ان اوراق کو پڑھیں!

"لیلیٰ" نے اپنے "خطوط" میں اپنے اُن عشاق کی نفسیات کا تجزیہ کیا ہے جو اُس عصمت فروش کی بارگاہ میں سجدے کرتے تھے۔ اور جن کے جنسی غرور کو بازار کی یہ حقایق شناس عورت دانستہ ٹھکراتی تھی تاکہ اُن مظالم کا انتقام لے جو ہماری سماج میں عورت پر کیے جاتے رہے ہیں۔ "روزنامچہ" میں زاویہ نظر کو میں نے بدل دیا ہے تاکہ لیلیٰ کے اُن ہی عشاق میں سے ایک یہ بتائے کہ وہ خود اپنی نفسیات کو کس نظر سے دیکھتا ہے ——— ایک

حقیقت تو زیادہ واضح "خطوط" میں کی گئی ہے مگر مرد کی اندھی جوانی نے لیلیٰ کے صنف کو کس نظر سے دیکھا۔ یہ وہ خود اپنے "روزنامچہ" میں بیان کرتا ہے! جس طرح "لیلیٰ کے خطوط" میں اسی طرح روزنامچہ میں ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں بالآخر یہ دونوں عناصر ایک دوسرے سے اتصال پیدا کرتے ہیں۔ اور پھر اُسی مقام سے مخالف سمتوں میں پلٹ جاتے ہیں —— اس طرح میں نے اپنے لیے اس داستان گوئی کا میدان غیر محدود رکھا تھا! در حقیقت میں نے کوئی ناول نہیں لکھا نہ کوئی افسانہ قلم بند کیا اور نہ "ادب لطیف" کا کوئی شاہکار تیار کیا —— صرف اپنے ایک "مطالعہ" کے لیے دو تین کردار وضع کیے، اون کے لیے ایک پس منظر اور ایک ماحول پیدا کیا۔ اُس پس منظر اور ماحول میں اُن نفسیات کے ایسے نقش و نگار بنانے کی کوشش کی جو زندگی کے ناقابل انکار حقایق سے قریب ہوں تاکہ اس آئینہ میں اقلیم عیش و نشاط کے بہت سے بے پروا راہ گیروں کو اپنی صورت صاف نظر آجائے! جنسی نفسیات کے اسی مطالعہ کے لیے میں نے

اُردو ادب میں ایک راہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش کہاں تک موثر اور کامیاب ہوئی اس کے متعلق میں خود اپنے اندازہ پر بھروسہ نہیں کرتا۔ لیکن اگر "خطوط" یا "روزنامچہ" کا کوئی ایک ورق، کوئی ایک حرف بھی، ایک نوک خار بنکر کسی دل میں کھٹکا ہو تو میں سمجھونگا کہ میری کوشش کامیاب ہوئی —— اس لمبے سفر میں اگر کسی ایک مسافر نے صرف ایک ہی قدم میرے ساتھ اُٹھایا ہے تو اُس کا وہی ایک قدم میرے لیے کافی ہے! ——
صرف ایک ہم سفر ہی میرا پورا قافلہ ہے!! اور صرف ایک قدم ہی میرے عزایم کی منزل مقصود ہے!

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے!

حیدرآباد۔ دکن
۱۵ مارچ ۱۹۴۵ء

محمد عبد الغفار

ہم دہر کے ان طوفانوں میں جو کچھ بھی نظارا کرتے ہیں
اشکوں کی زباں میں کہتے ہیں آہوں میں اشارہ کرتے ہیں

کیا تجھ کو پتہ کیا تجھ کو خبر دن رات خیالوں میں اپنے
اے کاکلِ گیتی ہم تجھ کو کس طرح سنوارا کرتے ہیں

اے موجِ بلا! ان کو بھی ذرا دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارا کرتے ہیں

(جذبی)

روزنامچہ

۱۸ فروری ۲۹ء

صبح ۵ بجے سویا، دو بجے سہ پہر کو جاگا۔ رات بھر ناچ دیکھتا رہا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی پیتا بھی رہا تھا۔ یاروں کی محفل میں اگر نہ پیجیے تو عیش گونگا، بہرا، لنگڑا اور اپاہج ہوکر رہ جاتا ہے! ....

یہ کون تھیں جو رات میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں؟ سنتا ہوں کوئی نئی آئی ہیں۔ خاصی دلفریب ہیں۔ عمر تو بہت کم معلوم ہوتی ہے چہرہ پر ابھی تو چھوکری پن برس رہا ہے۔ اور کسی انداز سے شرماتی ہیں! گھنٹوں میں نے سر ٹپکا مگر اللہ کی بندی نے کھل کر بات ہی نہ کی! شرم ورم تو کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں بہت چالاک

کر اپنے فن کے سبب امتحان پاس کر گئے آئی ہوں گی۔ ان قبروں کے
مردوں کا صحیح حال تو صرف دوزخ کے فرشتوں ہی کو معلوم رہتا ہے!
خیر حال جو کچھ بھی ہو۔ چیز بری نہیں ——— میں نے دیکھا رات
دس پانچ اور بھی اسی طرف نشانہ باندھے ہوئے تھے ——— بڑا ہی
حریص ہوتا ہے یہ جانور جسے مرد کہتے ہیں! عورت کے معاملہ میں
کبھی بس نہیں کہہ سکتا۔ جو مل جائے۔ جہاں مل جائے! کچھ نہیں تو
آنکھیں ہی سینک لے گا۔ اور ہے بھی یہ کہ دنیا میں آخر عورت کے
وجود کی اس کے سوا اور غرض ہی کیا ہے۔ "طلب" مرد کی ہے۔
اور وہ "مطلوب" ہیں۔ باغوں کے پھول بھی تو اسی لیے دامن میں
بھرے جاتے ہیں کہ وہ حسین ہیں اور معطر۔ ان کی نوع بکسر "مطلوبہ"
ہے۔ فطرت کے ان تقاضوں کو نہ قانون باندھ سکتا ہے نہ مذہب!
وہ تو ہمیشہ آزاد ہی رہے اور آزاد ہی رہیں گے ———
مرد مرد ہی رہے گا۔ اور عورت عورت ہی ———

۲۵ فروری ۲۹ء

میر صاحب کو "لیلیٰ" کے گھر بھیجا تھا۔ میں نے کہا
ذرا خبر تو لائیں کہ رنگ کیا ہیں۔ کتنے کتنے پانی میں ہیں منزل دور ہے
یا قریب! کتنا دوڑائیں گی اور کتنا تھکائیں گی ——— مگر میر صاحب تو

اور پُرفن ہوں گی۔ یہ انداز شرم بھی گویا ایک پینترا تھا! وہ سگریٹ جو ہاتھ سے گرا یا وہ بھی ایک ترکیب تھی کہ میں اُس کو اُٹھا کر پیش کر دوں اور اُن کی طرف توجہ کر دوں! اللہ بچائے عورت کے چلتروں سے! کیسی شکر چڑھی ہوئی گولیاں ہیں! اندر سے کڑوی۔ باہر سے میٹھی! پلکوں کے نیچے ـــــــ نرم بالوں کے اندر چھپے ہوئے! خوب دیکھ لیا۔ اِن سب کو! سُندر بائی نے کیسا پٹخا، ناک چنے چبوا دیئے بی مشتری نے کیا کیا جھکولے دیئے۔ دو برس تک کیسے کڑوے گھونٹ پلائے! روپیہ بھی دو۔ خوشامدیں بھی کرو۔ گالیاں بھی سُنو۔ جوتیاں بھی کھاؤ۔ دُنیا میں اپنی ناک بھی کٹاؤ۔ روتے روتے مر جاؤ۔ مگر پھر بھی جوں تک نہیں لگتی! خدا ہی بچائے اِن جادوگرنیوں سے! اب ذرا ان بی "لیلیٰ" کے رنگ بھی دیکھنے ہیں۔ بات ہی نہیں کرتیں۔ بیٹھی ہیں میرے پاس۔ مگر بولتی نہیں۔ بچاری! جلتا ہوا سگریٹ ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا ـــــــ گویا اتفاقیہ ایسا ہوا۔ جی ہاں! خوب سمجھتا ہوں! ایسی ہی ننھی تو ہیں! میں تو کہتا ہوں جان کر گرایا۔ تاکہ میں اس کو اُٹھا کر ان کی طرف متوجہ ہو جاؤں! کیا میں ان ترکیبوں کو جانتا نہیں۔ کمان زید کی طرف کھینچیں اور تیر لگے بکر کے سینہ پر!! ـــــــ ان کو بھی دیکھنا ہے۔ ابھی ذرا تو گرفتار رہیں ـــــــ

میر صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو اس شہر میں آئے آٹھ ہی دن ہوئے ہیں۔

یہ خبر لائے ہیں کہ وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں اور جو بات کرتی بھی ہیں تو مسومن کی۔ اٹھائے نہ اٹھے۔ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہیں۔ میر صاحب گئے۔ تو مطالعہ میں مشغول تھیں۔ یہ اپنا سا منہ لیے بیٹھے رہے۔ اور وہ مطالعہ میں مشغول رہیں۔ جب میر صاحب نے میرا ذکر چھیڑا اور محفل کی ملاقات اور سگریٹ والا واقعہ یاد دلایا تو کہنے لگیں۔ "جی ہاں! کوئی صاحب بیٹھے تو تھے۔ میں تو یہاں اجنبی اور نووارد ہوں۔ اور اس کے علاوہ ملنے جلنے کا کچھ شوق بھی نہیں۔ وہ میرے غریب خانہ پر تشریف لانا چاہیں تو تشریف لائیں۔" —— یہ دماغ! یہ مزاج! میں نے تو میر صاحب سے کہا تم نرے گدھے ہو۔ عورت سے ڈر گئے۔ یہ سنجیدگی تو ایک ادا ہے۔ ارے میاں صاف صاف مطلب بیان کیا ہوتا۔ معاملہ طے کر کے آئے ہوتے۔ کوئی ایسی راجہ کی بیٹی تو ہیں نہیں۔ ہیں تو وہی آخر جو ہیں۔ میر صاحب کہنے لگے! صاحب! مجھے تو پسینہ آ گیا۔ وہ بیگم بنی بیٹھی تھیں! میں نے جو ہمت کر کے کہا کہ آپ کے حسن کا بہت چرچا ہے۔ تو کیا بتاؤں کیا منہ بنا کر —— جیسے کوئی بازاری لونڈے سے بات کر رہا ہو —— اس نے کہا۔ حسن کو آپ کیا جانیں؟ اندھوں کے سامنے چراغ! آپ لوگ تو اپنی ہوس کو جانتے ہیں۔ دوسروں کے حسن سے کہاں واقف! آپ حسن کھال کے اوپر دیکھتے ہیں۔ اور وہ ہوتا ہے کھال کے نیچے!

کچھ اور عقل و تمیز کی باتیں کیجیے ——— " میر صاحب کہنے لگے۔
میں تو یہ لکچر سُن کر ٹھنڈا ہو گیا، کہتا کیا؟ ———
خیر، میں نے کہا یہ رنگ بھی دیکھنا ہے۔ ایک دن آئیں تو! زر بر سر
فولاد! سب فلسفہ رکھا رہ جاتا ہے ———

۱۲ر مارچ ۲۹ء

کیا کیا رستہ کشی ہوئی ہے۔ بارے کل شام تشریف
لائیں۔ کچھ بھی کہو۔ عورت تو ذہین اور دلچسپ ہے۔ ایسی سُلجھی ہوئی
باتیں کرتی ہے کہ میں تو حیران رہ گیا۔ پھر اُس کا حُسن اور اُس کی
نوعمری! میں نے تو بیتاب ہو کر یہاں تک کہہ دیا۔ کہ روز شام کو
تشریف لایا کیجیے۔ مگر کیا صاف جواب دیا ہے ظالم نے! کہنے لگی
" جی ہاں! اگر روز آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں تو
میری جان کھانے والے دس پانچ اور جو ہیں وہ کہاں جا کر سر پھوڑیں؟
میں تو جناب ایک جائداد مشترکہ ہوں۔ سرائے کی بھٹیاری ہوں۔
جو مسافر آئے اُس کا بستر بچھاتی ہوں۔ کھانا پکاتی ہوں۔ میں اپنی
سرائے کو چھوڑ کر کہیں جا بیٹھوں تو میرے مسافر کیا کریں! آپ اگر
میرے حال پر مہربان ہیں تو کبھی کبھی ضرور حاضر ہوا کروں گی"۔ ہنس
ہنس کر بات کرتی ہے۔ مگر اس کی ہنسی میں ایک جھلک ہے۔ زخم کے

خندۂ دندان نما کی! خدا جانے ہے کون یہ عورت؟ اس قبیلہ سے تو یقیناً نہیں ہے۔ میں نے کچھ دریافت کرنا چاہا تو صاف اُڑا گئی ——

۲۹ مارچ ۱۹۴۴ء

بہت بُلایا۔ نہیں آئیں۔ کہہ دیا کہ فرصت نہیں ہے!
میں نے دو تین خط لکھے۔ جواب ملا۔ "خط لکھنے کی فرصت ہوتی تو خود ہی نہ حاضر ہو جاتی"!
عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے یار لوگوں نے تو مجھے طعنے دینے شروع کر دیے ہیں "دھسپل پڑے۔ ریشہ خطمی ہونے لگے۔ پھنسا چاہتے ہو"! یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو پسند کرے۔ تو اس کے معنی عشق و اُلفت کیوں سمجھے جائیں! عشق تو ایک بازاری اصطلاح ہے۔ لغو اور بے معنی۔ درحقیقت عیش ہی کا دوسرا اصطلاحی نام عشق ہے۔ یہ شاعروں کا عشق نہیں کہ ایک عذاب ہو جائے۔ لاحول ولا۔ اصل چیز عورت ہے۔ اور مرد کی عورت طلب فطرت۔ میرا کوئی دوست کبھی میرے سامنے آ کر کہتا ہے۔ کہ "میں فلاں عورت پر مرتا ہوں"۔ تو میں تو صاف کہہ دیا کرتا ہوں کہ دماغ کا علاج کیجیے۔ شئے لطیف کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ یا خودکشی کر لیجیے۔ میرے کان کھانے کیوں آ گئے! میاں اختر ایک دفعہ کسی چھوکری پر عاشق ہو کر

ہائے ہائے کرتے میرے گھر آئے۔ لگے ہچکیوں سے رونے۔ میں نے کہا کچھ باؤلا ہوگیا ہے۔ اُلو کہیں کا۔ اگر عشق بازی ہی کرنا چاہتا ہے تو جو عورت آسانی سے حاصل ہوسکے اُس سے کرلے عشق بازی! دس پانچ مہینے۔ اگر شریفوں کی سی عشق بازی کرنا ہے، اور جو عورت نہ مل سکتی ہو اُس کے لیے رِیں رِیں کرنے سے کیا حاصل ——— چل بھاگ یہاں سے ——— تیرا معدہ خراب ہے یا جگر ماؤف ہے! اختر میاں اُس دن مجھ سے بہت خفا ہوگئے۔ اور جب تک مبتلائے عشق رہے خفا ہی رہے۔ جب وہ بھوت سر سے اُترا۔ تو پھر ایک دن آئے، شرمائی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے! ارے بھائی معاف کردو۔ لاحول ولا۔ کس خبط میں مبتلا ہوگیا تھا میں۔ لعنت بجانب شیطان! اُس چھوکری نے تو ناک چنے چبوا دیئے ——— خیر جھگڑا کٹا۔ اب تو سُنتا ہوں اُن کی شادی ہونے والی ہے۔ پہلے تو میرے ہی پاس پیام آیا تھا کہ شادی کرلو۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ کہاں عشق، کہاں نکاح! عشق بازی کہاں اور نکاح کہاں۔ عشق کی شعریت کو فنا کردینا ہو تو نکاح کے دروبست میں پھنس جائے! میں نے کہلا بھیجا کہ نیک بخت جہاں تمھارا دل چاہے شادی کرلو۔ میرے عشق کی تازگی نکاح کی خشکی کا تحمل نہیں کرسکتی! کیوں کیسی کہی! ——— پھر کہنے لگا یار! سُنتے ہیں ایک نئی آئی ہوئی ہیں۔

تم نے تو خوب ربط وضبط پیدا کر لیا ہے، ہمارا بھی کچھ حصّہ ہے یار،
میں نے کہا۔ باؤلے ہوئے ہو۔ میرا ہی حصّہ کہاں ———
ہے جو تمھارا ہو، وہ تو کچھ عجیب ہی ہے ———

۲۱ مارچ

بہت بُرا دن گزرا۔ مولانا خیرالزّماں صاحب خدا جانے
کہاں سے (ہر بلائے کز آسمان آید) نازل ہوگئے۔ پھر جب وہ آتے
ہیں۔ تو قطب بن کر جم جاتے ہیں! اُن کی عرفانیات کا ترشح ٹپاٹپ
شروع ہوتا ہے۔ گویا انسان ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے بندھا بیٹھا
ہے! حسب معمول مولانا کے پند و نصائح کا پٹارہ کھُل گیا۔ یہ گناہ۔
وہ گناہ۔ یہ صغیرہ۔ وہ کبیرہ۔ دوزخ اور فرشتے۔ اور منکر اور
نکیر۔ غرض ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر پھیر کر فرماتے رہے
حتیٰ کہ میرا ناک میں دم کر دیا۔ کہنے لگے میاں! اب تم شعور کی عمر تک
پہنچ گئے۔ اب ذرا اپنے ضمیر سے محاسبہ کیا کرو۔ گناہ کی زندگی کا
نشہ شروع میں تو بہت خوشگوار ہوتا ہے۔ مگر آخر میں تباہ کار
دجاتا ہے دو میرے بھائی" ——— یہ مولانا کا تکیہ کلام ہے
——— میرے بھائی! کب تک غافل رہوگے ——— پھر
اُنھوں نے نہ جانے کتنی آیتیں اور حدیثیں بیان کر ڈالیں ———

میں تو گناہ کا نام سُنتے سُنتے تھک گیا ہوں! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان کی زندگی میں گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔ گناہ! گناہ! گناہ! سوتے۔ جاگتے۔ کھاتے پیتے۔ ہنستے بولتے گناہ ہی گناہ ہے پانی پیؤ تو گناہ۔ روٹی کھاؤ تو گناہ۔ جو کچھ کرو گناہ۔ مولانا ہمہ تن ثواب اور ہم ہمہ تن گناہ!! میں نے بھی آخر جل کر کہا کہ حضرت! آپ اپنے مذہب کا پٹارا تو میرے سامنے کھولیے نہیں۔ یہ تو بازیگر کی جھولی ہے۔ میں آپ کے ڈھکوسلوں کا قائل ہی نہیں۔ جو بات آپ کہیں ذرا ساتھ ہی ساتھ اس کو سمجھاتے بھی جائیں۔ آپ کہتے ہیں مرد کا بغیر نکاح عورت کے پاس جانا حرام ہے۔ کیوں جناب؟ صرف اسی لیے کہ مذہب نے مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق ایک قانون بنا کر ہمارے سر پر رکھ دیا۔ لیکن نکاح میں ہے کیا، سوائے ایجاب و قبول کے۔ پھر اگر ایک مرد اور ایک عورت کے درمیان ایجاب و قبول ہو۔ مگر شرعی اصطلاحات نہ ہوں۔ تو نکاح بغیر بھی دونوں کا جنسی تعلق کیوں جائز نہیں؟ اور فرض کیجیے کہ کوئی شخص آپ کی مصطلحات اور قانونی ڈھکوسلوں کو مانتا ہی نہ ہو۔ تو پھر آپ اپنا قانون اُس کے حلق سے کیونکر اُتار سکتے ہیں۔ جو شخص آپ کے جہنم ہی کے وجود کا مُنکر ہو اُس پر "خَالِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا" کا کیا اثر؟ جناب مولانا! مَیں نے کہا، مرد عورت کے لیے ہے اور عورت مرد کے لیے۔

اور فطرت مذہب کے قید و بند سے لاچار ہو کر زمین کے نیچے سرنگیں
بنانے لگی۔ صاف اور ستھری حیوانیت کو آپ نے انسانیت سے خارج
فرما کر ایک خالی ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ زہد و تقویٰ کی نئی نئی
اصطلاحیں گڑھ لی گئیں۔ اُس حیوانیت کے پاؤں میں جو جزوِ انسانیت
ہے۔ آپ نے بیڑیاں ڈال دیں ــــــــــ عجیب
قسم کی یہ تنظیم ہے ــــــ حضرت مولانا بہت تحقیرانہ طریقہ پر
میری صورت دیکھ دیکھ کر مسکراتے جاتے تھے۔ مگر میں بھی کہہ ہی گیا۔
جو منہ میں آیا! عجب قسم کی یہ تنظیم ہے۔ مولانا! غذا سامنے رکھی
ہے۔ بہت آسانی سے انسان اس کو اٹھا کر کھا سکتا ہے۔ مگر آپ
نے اس کے دسترخوان سے منہ تک لے جانے کے لیے ہزاروں قاعدے
اور ضابطے بنا ڈالے۔ پہلے نوالہ یوں بناؤ۔ منہ اس طرح چلاؤ۔ کلی
اس طرح کرو۔ ہاتھ اس طرح دھوؤ۔ ڈکار اِس طرح لو
ــــــ فطرت کے معمولات تصنعات کی زنجیروں میں باندھ دیے
گئے ــــــ کام آسان تھا اُس کو مشکل بنا دیا ــــــ
واہ رے مذہب! مولانا فرمانے لگے۔ تیرا دماغ خراب ہے،
مذہب کو نہیں مانتا، مگر عقل کو تو مان! میں نے کہا۔ جناب!
عورت مرد کی مملوکہ اور مقبوضہ تھی۔ فطرت نے مرد کو اس کا

اس لیے نہیں کہ ان کو مذہب ایک دوسرے کا لباس بناتا ہے۔ بلکہ
اس لیے کہ فطرت مجبور کرتی ہے کہ مرد عورت کی طرف آئے اور عورت
مرد کی طرف جائے۔ زندگی کا ایک سلجھا ہوا سیدھا سادہ مسئلہ ہے
جس میں مذہب نے سینکڑوں گرہیں لگا دی ہیں۔ مولانا کہنے لگے اگر
فطرت ہی کے پابند ہوتے بھی تو اس نے کوئی حدِ اعتدال مقرر کر دی
ہے۔ اسی کا لحاظ کرو۔ میں نے کہا بیشک! لیکن اگر اعتدال کی حدود
سے تجاوز کیا بھی جائے تو اس کی سزا فطرت خود دیتی ہے۔ آپ کیوں
اپنا دوزخ جنت لے کر گھسے پڑتے ہیں؟ فطرت کے نمائندے آپ
کہاں سے بن آئے؟ فرمایا کہ دین فطرت ہے۔ اور دین کے نمائندے
ہم ہیں۔ میں نے کہا واہ صاحب کیا دین ہے اور کیا اس کے نمائندے
ہیں۔ فطرت کا سارا ڈھانچہ توڑ مروڑ کر اس کی صورت ہی مسخ
کر ڈالی۔ وراثت کا نیا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس ڈھانچے کو
قائم رکھنے کے لیے ازدواج کے قاعدے اور ضابطے مقرر کر دیے۔
عورت اور مرد کی فطرت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ خالص فطری ضرورتوں کو
کیا سے کیا بنا دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ فطرت اور مذہب میں
مقابلہ ہونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ فطرت
اپنے تقاضوں کو چوری چھپے پورا کرنے لگی اور مذہب کے دامن میں
ریا و مکر کے سانپ بچھو پرورش پانے لگے ——— پھر بھی آپ ہیں کہ

مالک اور آقا بنایا تھا آپ نے اتنے حقوق اُس کو دے ڈالے کہ وہ مرد کے تفوق ہی سے منکر ہو چلی۔ آپ ہماری جائداد چھین رہے ہیں ——— ہم کو بے دخل کیے دے رہے ہیں اور پھر گناہگار بھی ہمیں کو ثابت کرتے ہیں۔ فطرت نے عورت کی قیمت صرف اتنی مقرر کی تھی کہ

بڑھا کر جو اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

لیکن آپ نے مینا کو میخوار کا حصہ دار بنا دیا۔ وہ ہمارا کھلونا تھی۔ آپ نے اس کو ہماری ہستی کا "نصف" بنا دیا۔ واہ جناب۔ واہ۔ پھر آپ چاہتے ہیں کہ ہم شکایت بھی نہ کریں! مذہب نے مرد پر یہ ظلم ڈھایا کہ عورت کو اُس سے چھین کر غلام کو آقا کے ہم پلّہ بنا دیا۔ اور اب تو شدید حکم یہ ہے کہ اس کو نظر اُٹھا کر بھی مت دیکھو!! اس زبردستی کی پابندی کا نام آپ نے رکھا "زہد و تقویٰ!" یہ آپ کی قانونی اصطلاح ہے! میری ہی بلّی اور مجھ ہی سے میاؤں! یہ حالت آپ نے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی بنا دی! ان کو حقوق دیے گئے اور ہم سے چھینے گئے!! آپ کی اس قانون سازی کو حضرت! دُور ہی سے سلام! ———

کوئی اور ہوتا۔ میری جگہ، تو مولانا اس کے سر پر عصا کھینچ مارتے۔ مگر میری باتوں کو وہ باؤلی باتیں سمجھا کرتے ہیں۔ اس لیے

اکثر اس قسم کی بحث اپنی عادت کے موافق حسب ذیل دلائل میں سے کسی ایک یا سب دلیلوں پر ختم کر دیا کرتے ہیں۔ یعنی جس دن میں اُن کو زیادہ نہیں گرماتا تو وہ محض "احمق، پاگل، خبطی" کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ لیکن جس دن ذرا حرارت آجاتی ہے تو "لاحول ولاقوۃ" "توبہ توبہ" "اللھم احفظنا" وغیرہ ان کا خاتمۂ کلام ہوتا ہے۔ اور جو بحث نے طول کھینچا اور مولانا کا پارہ بہت ہی زیادہ چڑھ گیا۔ تب تو یہ گفتگو "لعین، مردود، کافر" کی گرج اور کڑک پر ختم ہوتی ہے!
——— آدمی بہت اچھے ہیں مولانا، مگر ذرا شئے لطیف کم ہے!!

۲۹ مارچ

رات بہت عرض معروض کے بعد غریب خانہ پر تشریف لائی تھیں۔ مگر کچھ اُداس اور افسردہ میں نے کہا تم کو یہ زیبا نہیں۔ تم تو دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے لیے بھیجی گئی ہو۔ ان حسین آنکھوں کو آنسوؤں سے کیا علاقہ؟ کہنے لگیں، میرا پیشہ ہنسنا ہنسانا ہے۔ مگر میری فطرت غمگین ہے ——— حُسن ہمیشہ غمگین ہوتا ہے ——— اور عشق بھی۔ ہوس البتہ خندہ برلب ہوتی ہے۔ اور گناہ قہقہے مارتا ہے! ——— گناہ! ———

کر رہی تھی! میں نے کہا ہم تم مذہب کے تخیل کی بیخی کے متعلق تو متفق الرائے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تم نے کیا کہا کہ مذہب نے عورتوں پر مردوں کو مسلط کر دیا۔ مجھے تو مذہب سے وجہ عداوت یہ ہے کہ اُس نے مردوں کے مالکانہ حقوق چھین کر عورتوں کو ہمارے سر پر چڑھا دیا!! ہاں! کہنے لگیں، ہمارا تمام خون پی کر بھی آپ کو شکوہ ہے کہ ہڈیاں باقی رہ گئیں! مذہب کا نام لے کر آپ گویا ماتم کر رہے ہیں کہ عورتیں آپ کے قابو سے باہر ہو گئی ہیں۔ مذہب سے آپ صرف اِس لیے خفا ہیں کہ اُس نے آپ کی رعایا کو حقوق دیکر اُن کے پاؤں کی زنجیروں کو قدرے ہلکا کر دیا ہے۔ اور مجھے مذہب سے یہ شکایت ہے کہ اُس نے اپنے قانون کا ہم کو جبراً پابند بنا کر اس قابل نہیں رکھا کہ تم لوگوں سے کافی انتقام لے سکیں! عجیب تماشہ ہے۔ ہم دونوں مذہب سے روگرداں ہیں لیکن دونوں کی روگردانی کے اسباب جُدا جُدا ہیں۔ اتحاد میں اختلاف! میں تو یہ کہتی ہوں ——— کہنے لگیں ——— کہ مرد اور عورت کے قضیہ کا مذہب کی عدالت میں فیصلہ ہی نہ کراؤ۔ اِس قضیہ کو فطرت کی عدالت میں پیش کرو۔ مذہب کی قانونی اصطلاح میں گناہ اور ثواب کو گناہ اور ثواب ہی نہ سمجھو۔ آؤ ہم تم اپنے ضمیر اور اپنی عقل سے محاسبہ کریں۔ فطرت یہ ہے کہ کوئی نر کسی مادہ کے قریب نہیں جا سکتا تاوقتیکہ

لیجیے یہ بھی گناہ اور ثواب کے اُلجھے ہیں اُلجھی ہوئی ہیں!! رات بہت دیر تک ان کو سمجھاتا رہا کہ گناہ اور ثواب کا تخیل انسانوں میں محض بزدلی اور مجبولیت کی نشانی ہے۔ میں نے کہا زندگی کے جس نظم کی بُنیاد تخویف اور تہدید پر ہوتی ہے۔ وہ آزاد انسانوں کو غلام اور مجہول بنا دیتا ہے۔ جب دل پر ڈر اور خوف کے نقوش ثبت کر دیے گئے۔ تو ضمیر کی آزادی ختم ہوئی! اسی کا نام لوگوں نے مذہب رکھ دیا ہے۔ کہنے لگیں مذہب کی تو میں بھی کچھ زیادہ قایل نہیں۔ مگر رسم و رواج کے مطابق نماز بھی پڑھ لیتی ہوں۔ کبھی روزے بھی رکھ لیتی ہوں۔ مجھے تو مذہب سے شکوہ ہے کہ اس نے مردوں کو عورتوں پر مسلّط کر دیا۔ یہ تم نے سچ کہا کہ خوف کی بُنیاد پر جو تنظیم کی جاتی ہے وہ انسانوں کی انسانیت کو مجہول اور مجبور بنا دیتی ہے۔ وہ نماز نماز کیا ہے جو دوزخ کے ڈر یا جنّت کی حوروں کی امید میں پڑھی جائے۔ لوگ مذہب کی پابندی زیادہ تر دوسروں کو دکھانے اور مرعوب کرنے یا ملامت اور بدنامی کے خوف سے کرتے ہیں۔ یہ سب یا تو بُزدل، جھوٹے اور مجہول ہیں۔ یا مکّار اور دُنیا ساز،

—— سیاہ اور گھنے ابرو پیشانی پر کھنچے ہوئے۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں معمول سے زیادہ کھُلی ہوئی —— اس طرح یہ چھوکری گناہ اور ثواب کے فلسفہ کی تصریحات سے میری مُدارات

مادہ بھی رضامند نہ ہو، لیکن انسانوں کی بستی میں مرد کا تفوق عورت پر کس طرح کارفرما ہوتا ہے؟ ذرا اس کو بھی دیکھو، عورت بغیر اپنی رضامندی کے مرد کے بستر پر کھینچ کر لائی جاتی ہے ـــــ اگر وہ زوجہ ہے تو شوہر کا حکم اُس پر واجب التعمیل ہے اور اگر وہ مجھ جیسی پیشہ ور ہے تو پیسہ اور زر اس کو مرد کی خوابگاہ میں حاضر کرتا ہے ـــــ چاندی کے چند سکوں کے لیے وہ اپنے فطری حقوق سے دست بردار ہوتی ہے اور مرد اپنے جنسی تقاضے پورے کرتا ہے ـــــ کہاں ہے وہ فطرت اور وہ فطری تفوق جس کو تم اپنی آقائی اور ہماری غلامی پر دلیل لاتے ہو؟ ـــــ مگر میں تمھیں بتاؤں۔ کہ میں کیوں اپنے کو تم سے بہتر اور برتر سمجھتی ہوں۔ تم مکّار اور بُزدل ہو۔ میں نہ مکّار ہوں نہ بزدل۔ میرے اندر تم سے بہت کم مجہولیت ہے۔ میں ایک گندہ پیشہ کرتی ہوں۔ لیکن اپنی گندگی کو چھپاتی نہیں۔ نہ اس کو پاکیزہ بنا کر دکھاتی ہوں۔ تم عیّاشی کرتے ہو۔ مگر دنیا والوں سے ڈر کر مکّاریاں اور حیلہ بازیاں بھی کرتے ہو۔ مگر اس طرح کہ اپنے فریب کے مکروہ چہرہ پر دولت یا مذہب یا دونوں کا نقاب ڈال دیتے ہو۔ میں کُھلّم کُھلّا اپنے گھر پر بیٹھ کر اعلانِ عام کے ساتھ حُسن فروشی کرتی ہوں۔ مگر تم جب مجھے اپنے گھر بُلاتے ہو۔ تو رات کی تاریکی میں۔ بند گاڑی کے اندر۔ برقعہ اُڑھا کر۔ پھر مجھے لے کر بیٹھتے ہو تو گھر کے

دروازے بند کرا کے ——— تمہارے دل میں دُنیا والوں کا خوف اور رسم و رواج کی غلامی موجود ہے۔ میں اس سے آزاد ہوں! اگر میرے تمہارے تعلقات مذہب کی اصطلاح میں گناہ بھی ہیں تو تمہارا گناہ میرے گناہ سے بدرجہا بدتر ہے۔ اس لیے کہ اس میں بڑا حصّہ مکر اور فریب کا بھی شامل ہے!

اِن ہی باتوں میں بلا مبالغہ ساری رات گذر گئی! کچھ عجب قسم کی عورت ہے! اس کی صورت میری حیوانیت کو مشتعل کرتی ہے۔ لیکن اس کی فلسفیانہ باتیں میرے دماغ کا گُودا نکال لیتی ہیں ——— مگر میں حُسنِ صورت چاہتا ہوں۔ میں مرد ہوں! آزاد اور مختار ہوں۔ بے پروا ہوں۔ وہ صرف ایک چھوکری ہے۔ ——— حسین اور دلکش۔ میرے نفس کی پیش خدمت ——— میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ آئندہ ملاقاتوں میں گفتگو کے اس پہلو کو درمیان میں آنے ہی نہ دوں گا ——— ——— میری ساری رات کیسی ضایع گئی ——— چھوکری کس قدر چالاک ہے! ———

۱۸/اپریل

اختر۔ محمود۔ ذکی۔ دانش سب کے سب دن بھر

جمے رہے۔ بستر سے اُٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ غول کا غول وارد ہوگیا۔ برج جو شروع ہوا تو دوپہر کا کھانا بھی بھاگم بھاگ کھایا۔ پھر جو جمے تو رات کے نو بجے دم لیا! نہ سورج کے طلوع کی خبر ہوئی نہ غروب کی! ہم سے بڑا بادشاہ کون ؟ وقت بے حساب۔ فرصت بے شمار، فکر صرف اتنی کہ دن میں چار دفعہ بھوک لگتی ہے۔ آفتاب نکلے یا غروب ہو جائے ـــــ ہمارے گھر کا چاکر ہے۔ اپنے وقت پر آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں۔ کہاں سے آیا اور کہاں گیا ـــــ جوانی! جوانی!! جوانی!!! ـــــ میں تو کہتا ہوں کہ آدمی جوان ہی مر جایا کرے۔ جس دن محسوس ہو کہ عمر کا ضعف اعضا میں پیدا ہونے لگا۔ کچھ کھا کے سو رہے۔ دُنیا کو ضرورت صرف جوانوں کی ہے۔ بڈھے تو مادرِ گیتی کے سینہ پر خواہ مخواہ پتھر کی طرح رکھے رہتے ہیں۔ اسٹڈ میں بڈھے گھوڑوں کو گولی مار دی جاتی ہے اِس لیے کہ مفت کا دانہ چارہ کیوں دیا جائے۔ کوئی ایسا ہی اسٹڈ انسانوں کے لیے بھی بنایا جائے۔ جوانوں سے جوانی کے سارے کام لیجیے۔ اور جب وہ بڈھے ہو چلیں تو ایک گولی کھلا کر کہیں توپ دیجیے! زندگی صرف جوانی ہے۔ بڑھاپا موت کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ اُس چوکھٹ پر پہنچ کر انسان کیسے کیسے بہانے کرتا ہے کہ کسی طرح

چوکھٹ کے اُس پار نہ جائے۔ کیا کیا فکریں اور تدبیریں کرتا ہے۔ طبیبوں اور ڈاکٹروں سے رجوع کرتا ہے۔ مقوّیات اور مفرّحات کھاتا ہے۔ بندر کی گلٹیاں اپنے جسم میں پیوست کراتا ہے۔ اُن کی معجونیں بنا بنا کر کھا جاتا ہے۔ موتی اور جواہرات گھول گھول کر پی جاتا ہے دُنیا بھر میں بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ کس قدر بیوقوف ہے۔ جانتا ہے کہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ شنبہ کو نہ ہی یکشنبہ کو۔ مگر سانپ کی چھچھوندر بن کر کچھ دنوں موت کے حلق میں اٹکا رہنا چاہتا ہے!! گدھا کہیں کا!! جوانی ہے، مزے کرتا ہوں۔ جب دیکھوں گا رات کو جاگنے سے سر میں درد ہونے لگا۔ سمجھ لوں گا کہ تیس مار خانی ہو چکی۔ اپنا بوریا بستر سمیٹ کر موت کو آواز دوں گا:۔ "آجا! میں فارغ ہوں! دنیا میں جو کچھ اچھا تھا اس میں سے میری جوانی نے اپنا حصّہ ایک ایک رتی وصول کر لیا۔ اب فرصت ہے۔ محفل برخاست ہو گئی، آجا! اور جہاں تیرا جی چاہے مجھے لے جا!" اس طرح میں کھیلتے کھیلتے کسی دن کہیں پھولوں کی ایک چادر پر یا کسی مہ جبیں کے آغوش میں ——— ——— سو جاؤں گا! ——— اس کے بعد کیا ہو گا؟ کچھ بھی ہو۔ مجھے کیا!

مولانا خیر الزمان تو عاقبت کا دُکھڑا لیے بیٹھے ہیں۔ واہ کیا زندگی ہے یہ بھی! زندگی میں عاقبت کے خوف سے مرتے رہو۔ بڑھاپے میں

فرماتی ہیں کہ تھیں اپنے کام سے کام (تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑتو)
تم دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلو! پھر ساتھ ہی ساتھ مردوں کی "نسوانیت"
پر طعن بھی! "لیلیٰ" کے بجائے کوئی دوسری "آرائش محفل"
ہوتیں تو میں کہتا کہ "حضور عالی! حُسن کی فریب کاریوں پر یہ غرور
تمسخر انگیز ہے! مرد ہر حال میں مرد ہی ہے۔ شیر اپنے شکار میں جنگل
کے دوسرے رہنے والوں کو شریک نہیں کیا کرتا! ــــــ مگر ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو چلا! غصّہ آتے ہی بگڑتا جاتا ہوں تیار
ہو کر بیٹھتا ہوں کہ آج آئیں تو ذرا مزاج پُرسی کروں۔ جب وہ
تشریف لاتی ہیں۔ تو میں موم کی ناک کی طرح پگھل کر رہ جاتا ہوں!
کبھی اپنی نسبت کچھ کہنا بھی شروع کیا تو وہ عجب طرح بھنویں اوپر
کھینچ کر، آنکھیں نیم باز کر کے مُسکراتی ہیں۔ اور کچھ ایسے انداز سے
میرا مذاق بنانا شروع کرتی ہیں کہ زِچ ہو کر رہ جاتا ہوں ــــــ
"ہاں! تو آپ کے دل میں درد ہے؟ ــــــ جی ہاں رفتہ رفتہ غیر نے
آپ کے دل کو خراب کر ڈالا! یہ عیّاشی کرتے کرتے عشق کیا شروع
ہو گیا؟ مجاز سے حقیقت کی طرف پرواز! تصوّف کا بہت بلند درجہ
ہے۔ جناب! مگر سُنئے تو۔ وہ سب بھی جن سے آپ خفا ہیں ابھی
حال میں ہیں! وہ سب بھی زندہ ہیں اور مرتے ہیں! کس کس کا
جنازہ اُٹھاؤں۔ کس کس کو کفناؤں ــــــ اتنی بہت سی قبریں ناتھ

موت کے ڈر سے پڑے کانپا کرو۔ اور جنت اور دوزخ کی فکروں میں بسورا کرو! یہ بھی گویا جینے میں کوئی جینا ہے۔ روتے ہی رہو۔ روتے ہی رہو اور روتے ہی چلے ——— جاؤ۔ پیٹے جاؤ اپنے نصیبوں کو!!

۲۲ر اپریل

وہ مجھ سے خفا ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ میں اُن کے احباب کو رقیبانہ نظر سے دیکھتا ہوں! چاہتی یہ ہیں کہ اُن کا فیضِ عام جاری رہے۔ وہ بہارِ حُسن لٹائے جائیں اور میں بھی اپنا حصّہ رسدی لیتا رہوں۔ بے چُوں وچرا! پرسوں جب وہ تشریف لائی تھیں تو میں نے اُن سے اِشارتاً کہا تھا کہ اُن کے "دیگر احباب" کے تذکرے اور وہ بھی اُن ہی کی زبان سے میرے لیے "فردوسِ گوش" نہیں ہیں۔ اُن کو میرے پاس بیٹھ کر اپنے احباب کے عشق والفت کی داستانوں کے بیان کرنے میں بہت مزا آتا ہے میں نے کہا مجھے تو اِن قصّوں سے معاف رکھیے۔ مجھ سے التفات کیجیے۔ اور دوسروں کی یاد کو گھر ہی چھوڑ آیا کیجیے ——— اب بہت خفا ہیں۔ کہتی ہیں تم میرے دوستوں کو اپنا رقیب بنا رہے ہو ——— گویا کہ وہ میرے رقیب ہیں ہی نہیں!!

عجیب ہے یہ عورت۔ اور عجیب ہیں اس کی باتیں! ہدایت

مجھ سے تو کھودی نہ جائیں گی ——— زمین میں خرید لیتی ہوں۔ قبریں اپنی اپنی سب کھُدوالیں ——— " ایک دفعہ دل کے اندر ایک آگ سی لگتی ہے - دل کہتا ہے - اس عورت کی سزا یہ ہے کہ محض انتقاماً اس کو بیوی بنا کر گھر میں بند کر دیا جائے ——— یہ خوبرو تیتری۔ اپنے رنگین پنکھوں پر کس قدر نازاں ہے ——— " پھر جو نظر اُٹھا کر اُن کی طرف دیکھتا ہوں تو جیسے کسی نے مُنہ پر ایک طمانچہ مار کر کہا " چپ - بے ادب ! " ——— پھر جب وہ چلی جاتی ہیں تو اپنے اُوپر لعنت بھیجتا ہوں - دل کہتا ہے " واہ حضرت ! واہ معلوم شد بافندگی ! آپ نے تو ہزاروں کے حُسن کو فتح کیا - آپ کی عیاشی اور حُسن پرستی کا تو ڈنکا بجتا ہے ! آپ جواں مرد ہیں - آپ کا حق ہے کہ جس عورت کو چاہیں فتح کر لیں ! اس عورت سے آپ کیوں بیٹھے جا رہے ہیں " اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں اور پھر عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ملاقات میں دو چار سخت جھٹکے دے کر اُس کا دماغ درست کر دوں گا ! آئیں تو اب کی دفعہ ! ساری تیزی و طراری نہ بھلا دوں تو لعنت ہے تجھ پر ! ——— کبھی سوچتا ہوں یہ عورت یوں قابو میں نہ آئے گی - بہت چالاک ہے - لاؤ نکاح کر کے پابند کر لوں ——— واللہ ! جو کہیں مجھ سے نکاح کر لے تو یہ ساری شاعری اور فلسفہ دُھواں بن کر اُڑ جائے ! ——— مگر نکاح کی

پابندیاں ——— میرے لیے؟ لاحول ولا ۔ پھر ایک آسان پہلو نظر آتا ہے ۔ نکاح کے بعد بھی کیا یہ ضروری ہے کہ مرد پابند ہوجائے، یہ پابندی تو صرف عورت کے لیے ہے! دیکھیے نا، مرد کو اپنے حرم سرا میں چار چار بیویاں بیک وقت رکھنے کی اجازت ہے، اور عورت ایک مرد سے زیادہ سے بیک وقت ازدواجی تعلق پیدا نہیں کرسکتی ۔ شریعت بھی مرد کے تفوق کی دلیل ہے! پھر کون بیوقوف کہہ سکتا ہے کہ نکاح سے مرد پر بھی اخلاقی پابندیاں عاید ہوتی ہیں، نکاح تو صرف قبضۂ مالکانہ کی شرعی توثیق ہے جیسے جائداد خرید کر عدالت میں اس کی رجسٹری! قیمت نقد یا وعدہ۔ اسی کا نام مہر ہے! ———

۲ر مئی

آخر چاہتی کیا ہے ۔ یہ عورت ؟ محبت کے نام سے بیزار ہے ۔ زر پرست ہے نہیں ۔ اُس کی تعریف کرو تو چڑیاتی ہے ——— کس قدر سرد اور خشک ہے! اپنی عیش کی خلوتوں میں مجھے "سرد" عورت سے کس قدر نفرت ہے ۔ ہر مرد کو ہوتی ہے۔ مرد عورت سے ہمیشہ اپنی حیوانیت کا جواب مانگتا ہے ۔ عورت

عورت ہے تو بہتر مصوروں کے شاہکار اور مصر کے مجسمے ہیں!
اُن ہی کو دیکھ کر خوش وقت ہولیا کریں ——— اور بھی ہزار شغل
ہیں۔ اور بھی ہزار تفریحات ہیں! خوبصورت مردے کو گود میں
لے کر کیوں بیٹھیں! مرد کی اس سے بڑی توہین ہی کیا ہوسکتی ہے
کہ وہ کسی عورت میں عشق کی گرمی بھی پیدا نہ کرسکے۔ وہ بربط نواز
کیا جو ساز کے صحیح تاروں کو اُنگلی بھی نہ لگا سکے! ———
گزشتہ ہفتہ دو دن تک میرے پاس رہیں۔ میں نے لاکھ لاکھ
پوچھا کہ آپ کا یہ رنگ کیا ہے۔ ہنستی رہیں۔ اور ہنستے ہی ہنستے
دو آنسو بھی نکل پڑے۔ پھر ہنسنے لگیں! ——— مجھ پر عورت کے
آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ صحبت عیش میں تو اس کے
آنسو بے لطفی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ مگر "لیلیٰ" کے وہ دو آنسو
جو برسوں میں نے اس کی آنکھوں سے گرتے دیکھے ——— اُن کو
اب تک بھول نہیں سکا ——— گویا وہ اُس کی آنکھوں سے نکل کر
وہ میرے دل میں اُتر گئے ہیں!! ——— مجھے کیا ہوگیا ہے۔
لاحول ولا! عورت کے آنسو دیکھ کر بے قرار ہوجانا ——— یہ بڑھاپا
ہے یا بزدلی! یہی حال ہے تو بس ہوچکی حسن پرستی!! ———
صبح اختر آئے تھے۔ "لیلیٰ" اسی وقت رخصت ہوئی تھی۔
میں کہہ اُٹھا وہ سایہ پڑا تھا۔ اوّل تو اختر مذاق کرتا رہا پھر کہنے لگا۔

"تم پھنس گئے ہو۔ سمجھے؟ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بُری طرح
پھنسے ہو۔" اس وقت میں نے بھی جو کچھ میرے دل میں تھا صاف صاف ان
سے کہہ دیا۔ اُس نے بہت ہی سنجیدہ آواز میں کہا "میں تمہارا
حال دیکھ رہا ہوں اُس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب سے [illegible]
کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اب ذرا سنبھل کر قدم بڑھانے یا
ہٹانے کا وقت آگیا ہے۔ اپنے نفس کا تجزیہ کرکے دیکھ لو کہ
تمہارے جذبات محض عیاشانہ ہیں جیسے کہ [illegible]
کچھ آگے بڑھ گئے ہو۔ اگر تم کو ذرا بھی شبہ ہو کر تمہارے قدموں
کے نیچے سطح ڈھالو ہے۔ تو یہیں سے اُلٹے پاؤں لوٹ پڑو۔ ورنہ
یاد رکھو مارے گئے۔ شکاری کتے کے دانتوں کی طرح [illegible]
دانت بند ہو کر پھر کھلتے نہیں ہیں۔ ساری شیخی کرکری ہو جائے گی۔
تمہارا دل اگر اس عورت کے متعلق واقعی بے چین ہے تو بہتر ہے
کہیں نہ کہیں نکاح کر لو۔ صرف یہی صورت بچاؤ کی ہے۔ تمہارے
خاندان ہی میں حسین اور دولت مند لڑکیاں موجود ہیں۔ عیاشی
تو تم خوب کر چکے۔ مگر یہ پھندا بُرا ہے۔ سُنتے ہو؟ یہ عورت کہیں تم کو
گدھا بنا کر نہ چھوڑ دے ——— اور خدا جانے وہ کیا کیا بکے گیا، جو میں
نے سُنا ہو تو لکھوں! گویا یہ سب سامانِ عاشقی فراہم ہو رہا ہے ———
ہمارے لیے ——— یعنی ایک ناصحِ مشفق [illegible]

۱۱ر مئی

اعلانِ اُلفت بغیر ارادے کے ——— آنسو، حتیٰ کہ ہچکیاں! عرضِ حالِ دل! بیتابیٔ تمنّا ——— غرض کہ کل رات بیٹھے بیٹھے بکھر گیا۔ یہ سب کیونکر ہوا۔ کیسے ہوا ——— مجھے تو خبر نہیں ——— مگر تھی بہت طفلانہ حرکت! اپنے اُوپر لعنت بھیج رہا ہوں۔ وہ ہنستی رہی۔ میں روتا رہا ——— توبہ توبہ ——— یہ مجھے کیا ہو گیا تھا! اس نے میری بیتابیوں کو بہت ہی تحقیر کی نظروں سے دیکھا۔ چلتے وقت تو وہ صاف کہہ گئی ——— مجھے اس کا ہر لفظ یاد ہے۔ "آپ اس وقت اتنے انسان نہیں جتنے گدھے ہیں۔ عورت بازی کرتے کرتے عشق بازی کرنے چلے! میں تو اب آپ کے ساتھ رات بھر اس سینہ کوبی میں شریک ہونے کے لیے آنے سے رہی!"

۱۹ر مئی

بلاتا ہوں۔ تو نہیں آتیں۔ ہار کر کل خود گیا۔ دروازہ بند کر لیا۔ میر صاحب کو بھیجا تو اُن سے کہا کہہ دینا کہ "جب تمھارا دماغ صحیح ہوگا تب آؤں گی۔ ابھی تو چالیس دن تک سر پر برف

کی تھیلیاں رکھے بیٹھے رہو!" ——

ابھی اختر آئے تھے۔ مواعظِ حسنہ کا ایک پشتارہ لے کر آئے تھے۔ خدا جانے کیا کیا بکتے رہے۔ کہنے لگے تم مرد ہو تمھیں اپنی صنف کے تفوق کو کسی عورت کے مقابلہ میں اس قدر پست نہ کرنا چاہیے۔ اور عورت بھی ایسی ذلیل —— ایک ٹکے کی عورت! ——

سُنتا رہا سُنتا رہا۔ وہ بکتے رہے۔ بکتے رہے۔ آخر میں نے کہا۔ "کب تلک کوئی نہ بگڑے، حال بگڑا جائے ہے! پند و نصائح کے ذخائر تم سے زیادہ میرے پاس ہیں —— میاں اختر! —— میں ایک بازاری عورت کے مقابلہ میں مفتوح اور بے بس ہو جانے کی ذلت کا بھی اندازہ کر سکتا ہوں —— جب وہ استہزا کرتی ہے اور مجھے ٹھکراتی ہے تو میرے قلب کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ گویا میں اپنی جان دے دوں گا اور اس کی جان لے لوں گا —— پھر جب اپنے خشک ہونٹوں کو تر کر کے اپنی مٹھیاں باندھ کر سینہ نکال کر سنبھلتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ میری اور میرے صنف کی جو توہین کر رہی ہے۔ اس کا جواب دوں۔ تو دفعتاً گویا ایک قسم کا فالج —— روحانی اور اخلاقی —— مجھ پر گرتا ہے۔ گونگا ہو جاتا ہوں —— وہ کہتی ہے —— سُنتے ہو اختر؟ ——

دنیا میں سب سے بڑا نامرد اور بزدل ثابت ہوئی ہے" ـــــــ
کیا تم ان تیروں کی نوک کو اپنے قلب میں کھٹکتے محسوس نہیں کرتا
ـــــ تمہیں کہتا ہوں کہ آج کے بعد "لیلیٰ" کی صورت نہ دیکھوں گا
اور پھر صبح کو اس کے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ کل ضرور آنا ـ کچھ سمجھ سکتے
ہو تم میری اس حالت کو؟ ـــــــ میری عقل گم ہے ـــــــ
یہ کیا ہو گیا ـــــ اختر تمہیں بھی نہیں معلوم اور نہ مجھے ـــــــ

۵ مئی

خطرہ، سامنے آنے میں ہے، نظر ملانے میں ہے،
میری آنکھیں سب سے زیادہ کمزور ہیں، وہ اس کو اس کے حسن کو
میرے باطن پر حملے کرنے کا راستہ دیتی ہیں! اب وہ تنہا ہے،
میں بھی خاموش ہوں ـ شاید کچھ دن اس طرح گذر جائیں تو پھر
میں اپنا توازن قائم کر لوں ـــــ آج کل شراب بہت پیتا ہوں،
اپنی محفل میں عورتیں بہت سی جمع رکھتا ہوں، دن بھر قہقہے مارتا
ہوں، ہنستے ہنستے رات کو کسی وقت غافل سو جاتا ہوں، صبح کو
اٹھ کر پہلے صبوحی، پھر ناشتہ! اڑا ہوا رنگ پھر جم جاتا ہے،
بجلیاں پھر کوندنے لگتی ہیں ـــــــ اس طرح تم
بھلائی جا رہی ہو، خبر ہے تم کو؟ ـــــــ کوئی میری محفل میں

لیلیٰ کا نام نہیں لیتا، میں بھی نہیں لیتا ——— زبانیں خاموش ہیں، دل میں پھر بھی وہ نام کھٹکتا ہے، جب کچھ کھٹک بڑھتی ہے ایک جام لبریز پی لیتا ہوں ——— یہ جواب ہے تیری زبردستیوں کا ——— او، ہائے، بے درمان!! ———

۱۱ مئی

ہرن کو پکڑ کر لائے تھے، اصطبل میں باندھنے کے لیے ——— وہ نہ بندھا، ایک ہی جست میں رسیاں تڑا کر کہاں سے کہاں پہنچا!! تیتری کو لائے تھے قفس میں بند کرنے ——— وہ اپنے رنگین پر پھیلا کر صاف نکل گئی! ———

——— بچہ ہٹ کر رہا تھا کہ وہ آسمان کے ماہتاب کو پکڑ کر اپنی گود میں رکھ لے! اُس کے ہاتھ پھیل کر رہ گئے! وہ وہاں تک نہ پہنچ سکے!! ——— زندگی کے نظم کو نہ توڑو، ہرن کو جنگل میں رہنے دو ——— وہی اس کا وطن ہے ———
تیتری کو شاخِ گُل پہ جھولنے دو ——— وہی اس کا مسکن ہے ——— چاند وہیں رہے گا جہاں ہے، بچّہ سے کہو اس کو دیکھ کر تالیاں بجائے اور ناچے۔ مگر اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے ———

تسکین دے لیتا ہوں، وہ عورت میرے لیے موزوں نہیں، اُس کے حُسن کی سنجیدگی میرے رندانہ عشق کی حریف نہیں ہوسکتی ——— جنس مختلف ہے، مذاق جُداگانہ ہے۔ ہم نے ایک دوسرے کو تول لیا، وزن ایک نہیں!! پھر یہ ساری دردسری کیوں!! ——— دل بہکاتا ہے، عقل سمجھاتی ہے ——— میں شراب کی بوتل پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتا ہوں، توبہ کرتا ہوں ——— شراب، جوانی، عیش اور حُسن کے ہنگاموں میں جب کبھی تھوڑا وقفہ ہوتا ہے، اور تسلسل ٹوٹ جاتا ہے تو پھر وہ یاد آجاتی ہے، عقل کہتی ہے "یہ تکلیف بھی چند روزہ ہے، گھبرا نہیں، تو بھول جائیگا ———

۲۸ مئی

گئی ہوئی واپس آرہی ہے ——— عقل

گذشتہ غلطیوں کا نام تجربہ ہے، حماقتوں کے بھنور میں یہ پھنس تو گیا تھا مگر بچ گیا، میرا فلسفہ آڑے آیا۔ دوست احباب تو سر پیٹ ہی رہے تھے کہ ہائے گیا ہاتھ سے! مگر گناہ کی قوت ابھی مجھ میں باقی ہے، "بی دربیلی" روٹھ کر بیٹھ رہیں، اور مجھے گردابِ اُلفت سے نکلنے کا راستہ مِل گیا، تم روٹھے ہم چھوٹے ———

اپنی عیاشی اور حُسن پرستی کی زندگی میں چند فلسفیانہ اور حکیمانہ اصول

میرے رہنما رہے ہیں، ان کو اس روزنامچہ میں قلمبند کیے دیتا ہوں تاکہ میرے آیندہ پیدا ہونے والے فرزند کے اُس وقت کام آئیں جب وہ جوان ہو کر عالمِ نسوان میں اپنے مجاہد باپ کی طرح فتوحات شروع کرے!

(۱) اپنے تمام افعال پر انسان کو ناز کرنا چاہیے۔ اور ان افعال میں جس قدر زیادہ گناہ (بہ اصطلاح عام) کی آمیزش ہو اسی قدر ان پر زیادہ ناز کرنا چاہیے!

(۲) گناہ کی کھیتی دماغ ہے —— نہ دل، نہ ضمیر —— اسی کو اپنے نفس کا رہنما بناؤ۔

(۳) معصوم اور گناہگار میں فرق صرف اتنا ہے کہ معصوم ایک بوسیدہ اور مُردہ ماضی رکھتا ہے اور اُسی کے دامن سے لپٹا پڑا رہتا ہے اور گناہگار ایک وسیع مستقبل رکھتا ہے اور اسی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے۔

(۴) عیاشی کی رُوح بوڑھی پیدا ہوتی ہے مگر عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی جاتی ہے، جس قدر گُناہ کرو اسی قدر روح جوان ہوتی جائے گی۔ البتہ جسم تو عمر اور جوان پیدا ہوتا ہے اور جس قدر زمانہ گذرتا ہے بوڑھا اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔

(۵) "اخلاق" ایک بے معنی اصطلاح ہے، عیش جس کے اندر

جنسیت کی لرزشِ حیات موجود ہو اصلِ حیات ہے۔

(۶) مرد کی زندگی میں عورت محض ایک ہندسہ ہے جس کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار اس کے محلِ وقوع پر ہے۔

(۷) وسوسہ اور ترغیب کا علاج امتناع نہیں ہے، ارتکاب ہے! میری زندگی کے ایسے کتنے ہی روشن اصول میرا راستہ صاف رکھتے ہیں میری اولاد کا راستہ بھی صاف رکھیں گے۔ اور جو کوئی اس روزنامچہ کو پڑھے گا اُس کا بھی! اختر سے آج میں نے کہہ دیا کہ عشق کا تپ ولرزہ دو چار حملوں کے بعد ختم ہو گیا ہے، میں اب پھر ایک ہوشمند انسان ہوں اور حسن کا بے پروا ڈاکو! اختر خوش ہو گیا اس کا چہرہ دمک اٹھا، کہنے لگا، خوب بچے یار، بال بال بچے، تو آؤ ایک جام! بیاد رفتہ لیلیٰ!

---

۴ رجون

اِتنی خفا ہوئیں کہ اس شہر سے بھی چلی گئیں، میر صاحب خبر لائے تھے میں نے کہا میر صاحب جانے والوں کی خبر لاتے ہو، آنے والوں کی خبر لاؤ، کوئی نیا مال آیا ہو، کوئی نئی دکان کھلی ہو تو پتہ بتاؤ، رہیں لیلیٰ کی قسم کی عورتیں، سو انھیں تو یا عجائب خانہ میں رکھو کہ اہلِ نظر مطالعہ کیا کریں یا جہاز کا ٹکٹ ولوا کر حج کے

لیے روانہ کر دو! عمل کی دُنیا میں اس قسم کی عورتوں کا وجود اہلِ کمال کو سرگرداں کرتا ہے!

۶؍جون

زندگی نام ہے حرارت اور حرکت کا، مگر سوال یہ ہے کہ اس حرارت اور حرکت کی استعداد کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر کے زندگی کی مدت بڑھائی جائے! یا جلد اور زیادہ مقدار میں خرچ کر کے آمد اور خرچ کی میزان کو بعجلت برابر کر دیا جائے؟ چراغ کی بتی نیچی اور پتلی رکھی جائے تاکہ مدہم روشنی دیر تک باقی رہے یا موٹی سی بتی ڈال کر اور جلدی جلدی اس کو بڑھا کر تیز روشنی کی جائے اور جو تیل دس راتوں کام دیتا اس کو ایک ہی شب میں خرچ کر ڈالا جائے؟ روشنی کی تیزی زیادہ اچھی یا چراغ جلنے کی مدت کا طویل ہونا بہتر؟ جن کو اللہ میاں کہا جاتا ہے انھوں نے تو انسان کو عجب مخمصہ میں پھنسا دیا ہے! یعنی یا تو ہلکی اور مدھم روشنی میں گھر کے نیم تاریک کونوں میں پڑے ٹٹولتے رہو اور اس طرح زیادہ عرصہ تک اندھیرے میں اپنا سانس جاری رکھو یا ایک ہی شب میں چراغ کو تیز جلا کر سارا گھر بقعہ نور بنا دو اور باقی سب راتیں بالکل اندھیری رکھو! چراغ کے تیل کی مقدار مقررہ ہے،

ازل کے کسی مشعل فروز نے ہر چراغ کو اس کے حصّہ کا تیل ناپ تول کر دے دیا ہے، اس مقدار میں بیشی خارج از بحث ہے، خرچ کا اوسط، البتہ، اگر تم چاہو تو کم و بیش ہو سکتا ہے! اب بتلائیے؟ درآمد پر قابو نہیں، برآمد ایک حد تک اختیاری ہے۔ پھر کیا کیا جائے؟ ——— جوانی میں زندگی کی ساری پونجی پھونک ڈالیے یا بڑھاپے کی انتہائی حد تک زندہ رہنے کے لیے اُس پونجی کو حد درجہ کفایت شعاری اور جُزرسی کے ساتھ خرچ کیجیے ——— ایک شب چراغ کی پوری روشنی سے شب کو دن کر دیجیے یا اس چراغ کو ستّر اسّی برس کی عمر تک ٹمٹمانے دیجیے آندھیوں سے بچائیے، ہوا کے تیز جھونکوں سے محفوظ رکھیے ——— دامن کی آڑ میں، کسی کونہ کے طاق میں، کسی فانوس کے اندر، ——— ہر روز تیل اور بتّی کا معائنہ کرتے رہیے۔ اب بتّی اتنی باقی ہے، تیل اتنا ہے، ہوا تیز ہے، کہیں آندھی نہ آجائے، تیل نہ گر جائے، بتّی خشک نہ ہو جائے ———

ان ترددات میں بدحواس رہیے، مگر زندہ رہیے ———

سانس آپ کا چلتا رہے، یہ نہ رُکنے پائے!! ———

مکان جب بوسیدہ ہو جائے، اُس کی دیواریں جھک جائیں، اُس کی محرابوں میں شگاف پیدا ہونے لگیں، تو کیا یہ بہتر نہیں کہ

اُس کو گرا دیا جائے ؟ یا یہ بہتر ہے کہ اُسی کھنڈر میں پڑے رہیئے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیے کہ آج یہ دیوار گری، کل وہ چھت بیٹھ گئی، یہ ستون ٹیڑھا ہو گیا۔ وہ بنیاد غرق ہونے لگی ـــــ روز اس عمارت کی تباہی کو پڑے دیکھتے رہیے مگر ارادہ یہ رکھیے کہ جب تک دو اینٹیں بھی باقی ہیں ہم تو اسی گھروندے میں بیٹھے رہیں گے، تا آنکہ اُس کی آخری دیوار کے نیچے دب کر رہ جائیں !! ـــــ

اُس نقطہ پر پہنچ کر جہاں سے جوانی کا انحطاط شروع اور بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے اس قسم کے سوالات ہم جیسے اہلِ بصیرت کے دلوں میں پیدا ہوا کرتے ہیں، ان سوالوں کے جوابات تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنے دُنیا میں انسان، ہر شخص اپنے دماغ میں ایک جواب رکھتا ہے۔ لیکن میں تو کہتا ہوں، زندگی سے موت کا خطرہ نکال دیجیے ! یہ تو اپنے اختیار میں نہیں کہ فنا کی شرط کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں ـــــ ہوتا تو یہی کرتے ـــــ لیکن موت کے خطرہ کی تلخی کو زندگی کی حلاوت سے جدا کرنے کی ترکیب تو کچھ مشکل نہیں کہ موت کے تمہارے قریب پہنچنے سے پہلے تم خود اُس کے قریب پہنچ جاؤ ! بجائے اس کے کہ وہ آئے اور اُس کے آنے کے خطرہ کے خیال میں تم اپنی جان گھلاؤ، تم ہی اُس کے پاس

بے تکلف، ہنستے کھیلتے !! اس طرح چلے جاؤ!
زندگی کے لطف آخر کو تم موت کے خیال کی تلخیوں سے بچالوگے۔
پہلے اس سے کہ ڈاکوؤں کی جماعت تمہارے گھر پر دھاوا کرے
تم اپنی ساری دولت لٹادو اور جب کچھ نہ رہے تو گھر کا دروازہ
کھول کر پکارو :۔ آ! لوٹنے والے! آجا! لوٹ! کیا لوٹتا ہے،
چھین! کیا چھینتا ہے !! — یہ فلسفہ ایسی جوانی کا ہے جو
بڑھاپے کی چٹان سے بندھا ہونا پسند نہیں کرتی، جو اپنے گلے میں
بڑھاپے اور موت کے امکانات کا بھاری پتھر لٹکانا نہیں چاہتی
— زندہ رہو جب تک جوان رہو اور جب بڑھاپا اپنے آنے
کی اطلاع بھیجے تو دفعتاً مرجاؤ، فنا ہوجاؤ! یہ فلسفہ لوگوں کی سمجھ
میں تو آتا ہے مگر وہ اس کو مانتے نہیں۔ یہ سب بدبخت اس
غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ بڑھاپے میں بھی کچھ نہ کچھ جوان
رہنے کی کامیاب کوشش کرسکتے ہیں! پرانی تیلیوں پر ہر چھٹے
مہینے نیا غلاف چڑھاکر گویا تیلیوں کو بھی نیا کرلیا جاسکتا ہے!
سونا کھائیں گے، جواہرات گھول کر پی جائیں گے، جسم کی رگوں
میں سوئیاں بھونک بھونک محرک دوائیں پہنچائیں گے تاکہ اُن کے
آغوش میں عورت اُن کی گرفت کو کمزور محسوس نہ کرے، پوپلے
منہ میں نئے دانت لگائیں گے تاکہ اُن کے بوسوں کا چٹخا جوانی کے

بوسوں سے ملتا جلتا رہے! سفید بالوں پر خضاب کی اختر کاری کریں گے تاکہ ۶۰ برس کی عمر میں عورت اُن کو ۴۰ سے زیادہ کا نہ سمجھے، عمر دریافت کیجیے تو ہمیشہ ۵۰ کی بجائے ۳۰ بتائیں گے اور ۳۰ بتاتے ہوئے بھی شرمائیں گے، دل میں شکوہ کریں گے کہ کیوں اُن کی اجازت کے بغیر عمر بڑھ جاتی ہے!! جس قدر عورت اپنی عمر کو ظاہر کرتے گھبراتی ہے اُسی قدر وہ بوڑھا مرد بھی جو جوان بننے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہو عمر کے متعلق کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے گھبراتا ہے ——— یہ گھبراہٹ قبول، یہ شرمندگی قبول، یہ ضعف قبول، بڑھاپا قبول، مگر زندگی عزیز ——— مرتے ہیں کہ کسی طرح موت کے آنے کو ملتوی کیا جا سکے ——— مگر وہ آئے گی ضرور، زندگی کے پادر ہوا حقایق میں صرف وہی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے! ———

سامنے سے میاں اختر چلے آ رہے ہیں، چہرہ پر رونق ہے، لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ ——— رات اس بدمعاش نے ضرور کوئی نیا شکار مارا!

۱۱ر جون

کہتے ہیں کہ کل رات دو بجے زلزلہ آیا تھا، کہی

جھٹکے محسوس کیے گئے، شہر میں کچھ پُرانے مکانات گر گئے، کچھ نئی دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے، دس بیس گھروں میں محرابیں شق ہو گئیں، ستون ٹیڑھے ہو گئے ــــــ آج کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر چار، پانچ ہزار آدمی ہلاک ہوئے، ایک دو شہر بالکل ہی تباہ ہو گئے ــــــ بس! اتنی سی بات کا ایک ہنگامہ بپا ہے! گویا کہ زلزلہ ایک بالکل نئی قسم کا واقعہ ہے جو انسان کی زندگی میں کبھی پہلے پیش نہ آیا تھا، ایک ایسا حادثہ ہے کہ اُس جیسا کبھی پہلے نہ سُنا گیا نہ دیکھا گیا، گویا کہ کل سے پہلے نہ کبھی کوئی دیوار گری تھی، نہ کوئی محراب شق ہوئی تھی نہ کوئی مرا تھا!! گویا چار پانچ ہزار آدمیوں کا مرجانا تو بالکل ہی عجیب واردات ہے جو آج تک کسی انسان کے خیال و گمان میں بھی نہ آئی تھی!!

ــــــ صبح ہی صبح مولانا دوڑے ہوئے آئے، ارے جناب! کل زلزلہ آیا، کیا قیامت کا زلزلہ تھا، اللّٰھم احفظنا، کوئی جھٹکا آپ نے بھی محسوس کیا؟ مَیں میر صاحب کی بدحواسی کو دیکھ کر ہنس پڑا۔ زلزلہ؟ زلزلے تو ہماری زندگی میں روز ہی آتے رہتے ہیں، نئی کیا بات تھی، مولانا؟ مولانا کی اور میری گفتگو بہت دلچسپ تھی، جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں۔

مولانا: ــ کیوں حضرت آپ نے بھی کوئی جھٹکا محسوس کیا؟

میں :- جی ہاں! میں ٹھیک ۲ بج کر ۵ منٹ پر بوتل سے گلاس میں لوٹ رہا تھا، جھٹکا جو آیا چھلک گئی! اور اُس وقت وہ جو میرے پاس تھیں وہ گھبرا کر میرے سینہ سے چپٹ گئیں، اور میں نے جو چھت کو ہلتے دیکھا تو میں سمجھا کہ آج آپ کا گز رنگ ذرا تیز تھا! اور میں نے "میر صاحب" جلدی سے ایک گلاس خالی کر کے دوسرا بھر لیا، میں نے کہا اگر چھت سر پر گری تو میں ایک آخری جرعہ سے کیوں محروم رہ جاؤں، کیوں مولانا؟ یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟

مولانا : ـــ حضرت! مذاق تو چھوڑیئے، مذاق کا کیا موقعہ ہے ــــــــ

میں :- مذاق؟ مذاق کیسا مولانا؟ میری آپ کی گفتگو ہمیشہ سنجیدہ ہوتی ہے۔ زلزلہ آیا، اس میں تو کلام نہیں، یہ اندیشہ بھی بجا نہ تھا کہ مکان گر پڑتا اور میں دب کر مر جاتا، بلکہ میرے ساتھ وہ بھی مر جاتیں جو اُس وقت آرائش خلوت تھیں! ان امکانات میں مذاق کی گنجائش کہاں؟ مگر ایسا ہو جاتا تو آئندہ کے بہت سے امکانات سے بہتر ہوتا، رات میں بچ گیا اور اگر اسی طرح آیندہ زلزلوں سے بھی بچتا رہا تو بڑھاپا شروع ہو جائے گا، صحت خراب ہونے لگے گی،

زیادہ پیوں گا، تو سر میں درد ہوا کرے گا، پھر گردوں
میں درد ہوا کرے گا، پھیپھڑے خراب ہو جائیں گے جگر
ماؤف ہو جائے گا، دس پانچ مہینے پلنگ پہ پڑا رہوں گا،
اطباء اور ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنوں گا، آپ جیسے دوستوں
کو تیمارداری کی تکلیفیں برداشت کرنی ہوں گی ——
اِن مصیبتوں کے بعد مشکل سے مروں گا —— دس برس
بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ رات ہی ہو جاتا —— ایک ہاتھ میں
جامِ شراب، ایک ہاتھ یار کی گردن میں، اوپر سے گرتی
چھت! —— صبح کو آپ سب احباب آکر بیٹھ کر،
اینٹوں اور کڑیوں کے ڈھیر کے نیچے سے میرے کچلے ہوئے
جسم کو نکالتے ——

مولانا :- توبہ توبہ، حضرت! آپ تو موت سے مذاق
کرتے ہیں ——

میں :- مذاق وذاق نہیں مولانا، بات یہ ہے کہ جب مسافر کو
اپنی منزل پہ جانا ضرور ہو تو قریب کا راستہ کیوں نہ اختیار
کرے، دلی سے کلکتہ جانا ہو تو کشمیر ہو کر کیوں جائے ذرا
سوچیے تو! —— میں تو یہی کہتا ہوں کہ بات بڑا اچھا
موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔

مولانا :- لاحول ولاقوۃ، آپ بھی کیا باتیں کر رہے ہیں، ذرا غور تو کیجیے ملک کے ایک حصّہ میں قیامت صغریٰ بپا ہے، ہزاروں بچے یتیم ہو گئے، ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں، ہزاروں انسان بے خانماں ہو گئے ـــــــ

میں :- اجی مولانا، مولانا، ذرا تو ٹھہریے، آپ تو مُنہ اُٹھائے بھاگے جا رہے ہیں، ذرا لگام کھینچے ہوئے! سوچتے نہیں۔ کہے چلے جاتے ہیں، آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ گویا دُنیا میں جو کچھ نہ ہونا تھا، اور کبھی نہ ہوا تھا، وہ سب ہو گیا۔ اے حضرت! بچّے تو سب ہی یتیم ہوا کرتے ہیں۔ میں اور آپ دونوں یتیم تو یہیں بیٹھے ہیں، عورتیں بھی سب کبھی نہ کبھی بیوہ ضرور ہوتی ہیں، مکانات ویسے بھی مسمار ہوا ہی کرتے ہیں ـــــــ پھر نئی بات آپ کو کیا معلوم ہوئی؟ رہا یہ امر کہ ہزارہا آدمی بے خانماں ہو گئے اور ہمدردی کے مستحق ہیں تو جناب اس دُنیا میں کروڑوں انسان ہر لمحہ مبتلائے عذاب رہتے ہیں ان کروڑوں میں اگر دس پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا تو آپ کی روح کیوں تحلیل ہونے لگی؟ یہ تو ماں باپ کی غلطی ہے کہ بچّے یتیم ہو گئے، اُنھوں نے پیدا ہی کیوں کیے، جو عورتیں بیوہ

ہونے سے گھبرائیں وہ شادی ہی کیوں کریں، اور جو لوگ بے خانماں ہونے سے ڈریں وہ مکانات ہی کیوں بنائیں، جائیدادیں کیوں خریدیں، بستیاں اور شہر کیوں آباد کریں ——— مولانا بیچارے کچھ نہ سمجھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، کچھ بسورنے لگے، جب مولانا سے جواب بن نہیں پڑتا تو بسورنے لگا کرتے ہیں! میں نے کہا مولانا یہ جو ہمدردی کا جذبہ انسان سے ظاہر ہوتا ہے اس کی حقیقت بھی کچھ آپ کو معلوم ہے یہ جذبہ درحقیقت خوشی اور اطمینان کا جذبہ ہے، اس کا تجزیہ کیجیے تو اس کے اندر بڑا عنصر خوشی اور اطمینان معلوم ہوگا (مولانا نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوب سکیڑ کر مجھے گھورنا شروع کیا) جب کوئی شخص کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تو وہ گویا اپنے اطمینان و آسایش کے مقابلہ میں اُس شخص کی مصیبت کو دیکھتا ہے اور اِس امر سے مطمئن ہو کر کہ میں خود بہ عافیت ہوں کہتا ہے "افسوس زید کس قدر بیمار ہے" وہ ڈرتا ہے کہ کہیں وہ خود اِس قدر بیمار نہ ہو جائے اور خوش ہے کہ اُس کی یہ حالت نہیں!! کچھ نہیں مولانا یہ ساری ہمدردی کچھ خوف ہے اور کچھ خود غرضی! کسی کو

مرتے دیکھتے ہو تو زبان سے کہتے ہو کہ افسوس! مرگیا بیچارہ، اور دل میں کہتے ہو کہیں ہم نہ مرجائیں، شکر ہے کہ زندہ ہیں، بھئی فی الحال یہی غنیمت ہے کہ اُسی کو موت آئی، ہم زندہ رہے، غنیمت ہے! یا جب کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا دیکھتے ہو تو کس قدر ہمدردانہ لہجہ میں کہتے ہو، ہائے! بیچارے پر کیسی مصیبت پڑی ہے مگر اُس وقت تم اپنے بنک کے پاس بک کی آخری میزان کا تصوّر کرتے ہوتے ہو اور تمہارا دل چُپکے چُپکے کہتا ہوتا ہے، شکر ہے، میرے پاس تو دولت کافی ہے، خدا نہ کرے میں فاقے کروں! تو حضرت مولانا! ہمدردی وہمدردی کو رکھیے بالائے طاق۔ جن کو مرنا تھا مرگئے، جن کو یتیم ہونا تھا ہوگئے، ہمارا آپ کا وقت آئے گا تو ہم بھی لٹھے کا ادھا تھان لپیٹ کر قبر میں جائیں گے، اور ممکن ہے کہ کفن بھی نصیب نہ ہو! آخر وہ ایسی بات کیا ہے جس کے لیے آپ اخباروں کا پلندا بغل میں ڈالے ہوئے، صبح ہی صبح میرے غریب خانہ پر نازل ہوگئے! اے حضرت! زلزلے تو صبح سے شام تک آتے رہتے ہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ جب زمین ہلے جب ہی آپ کہیں کہ زلزلہ آیا؟ جب میں کسی حسین عورت کو دیکھتا ہوں تو زلزلہ آتا ہے، جب آپ کی

ملانی آپ کو ڈانٹتی ہیں تو زلزلہ آتا ہے، جب میرے گھر
کسی شب کو شراب کا گودام خالی ہو جاتا ہے تو زلزلہ آتا
ہے، آپ کا بڑھاپا زلزلوں سے خالی نہیں اور میری ساری
جوانی زلزلوں سے معمور ہے!! پھر اس اختلاج قلب کے کیا
معنی؟ بسُورتے کیوں پھرئیے، افسوس کہ مولانا!
آپ پیتے نہیں ورنہ ایک جام لبریز پیش کرتا اور کہتا کہ ہاں

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو!

میں چھوٹی میز پر سے سگریٹ کا بکس اٹھانے
مڑا اور جو لوٹا تو دیکھا کہ مولانا مع جوتیوں کے غائب
سیدھے محلہ کی مسجد میں گئے ہونگے، نفل پڑھے
ہوں گے، توبہ کی ہوگی، میرے لیے ہدایت اور نجات کی دعائیں
مانگی ہوں گی، اور زلزلہ کا خیال آیا ہوگا تو ردِّ بلا کا وظیفہ پڑھنے
بیٹھ گئے ہوں گے ـــــ واہ مولانا، واہ ـــــ

۴ / جولائی

ایک مہینہ بمبئی کی سیر و تفریح میں گذرا، چند
پرزوں پر وہاں کے کچھ مشاہدات لکھ لیے تھے، خدا جانے وہ پرچے
کہاں پھینک دیئے، تھکا تھکا یا گھر آیا ہوں، سوچتا جاتا ہوں

اور لکھتا جاتا ہوں، بہت سی باتیں یاد نہ رہیں، خیر، جو یاد ہیں اُن کو تو لکھ لوں۔ ہر وہ بات جس کا تعلق عورت سے ہو مجھے عموماً یاد رہتی ہے، سوائے اُس صورت کے، کہ عورتیں ہوں تعداد میں زیادہ اور ایک کی یاد دوسری کی یاد پر چڑھتی چلی جائے!!

——— بمبئی کی سیر زیادہ تر طالب علمانہ تھی یعنی "فن" کے متعلق معلومات میں کافی اضافہ ہوا، حُسن فروشی کی ادنیٰ دُکانوں پر اور عامیانہ بازاروں میں، اُن گلی کوچوں میں جہاں "شرفا" دن کے وقت نہیں جاتے مگر رات کو جاتے ہیں کچھ حرج بھی نہیں سمجھتے! جگہ عورت کی فطرت کا "مطالعہ" پُرلطف بھی ہو سکتا ہے اور عبرت انگیز بھی! مجھے لطف سے کام عبرت کی آنکھ بند رکھتا ہوں، پھر بھی بمبئی کے اُس بے تکلف اور بے حجاب طبقہ کی زندگی کا فلسفہ، میرے لیے دلچسپ تھا اس لیے کہ نیا تھا۔ پہلی دفعہ یہ تماشا میں نے دیکھا کہ مصر بازار بلایا اور پکارا گیا ہوں، ہندوستان کی عورت مرد کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی ہے؛ مگر بمبئی کی یہ بین الاقوامی آبادی خود ہر داشت وار آگے بڑھ کر مرد کو ٹوکتی ہے! کدھر چلے، اِدھر آؤ!! آپ اُن کے دروازوں کے قریب سے گذریئے وہ عجیب عجیب آوازوں سے مختلف اور نئی نئی زبانوں میں آپ کو مخاطب کرتی ہیں، جس وقت آپ اُن کے "عیش کدہ"

ہیں داخل ہوں "مائی ڈیر" اور "ڈارلنگ" کی بھرمار رہتی ہے،
جب آپ کے دونوں پاؤں چوکھٹ کے اس طرف پہنچ گئے تو پہلا
سوال ہوتا ہے :- "ہو پیچ" ؟ فضولیات اور تمہیدات کی وہاں
اجازت ہی نہیں، وقت بہت قیمتی ہے، حاشیہ کی عبارت بالکل
نہیں، جو کچھ ہے متن ہی متن ہے! گاہک آئے، سودا خریدے
اور چلا جائے! با فضولی چہ کار! ——— ایک دن اتفاقاً ایک
ذرا پڑھی لکھی چھوکری مل گئیں، جب اُنھوں نے بھی خالص کاروباری
انداز اختیار کیا تو میں نے اُن سے کہا :- "مس صاحبہ! مجھے تو آپ
کی اس تاجرانہ ذہنیت سے گھن سی آتی ہے، عورت اور مرد کی
یکجائی کا لطف مزے مزے کی باتوں اور دلچسپ گفت و شنید
میں ہے، جسم کی کشش تو تعیش کا محض ایک جزو ہے، یہ نہیں کہ
نان بائی کی دکان پر دو خمیری روٹیاں جس طرح بنا حلق سے اتاریں،
دو گھونٹ پانی پیا اور دانت کریدتے ہوئے چل نکلے. تعیش کی
لازمی شرط اطمینان اور فرصت ہے، عیش پسند کھانا بھی کھاتے
ہیں تو دو گھنٹہ آہستہ آہستہ منہ چلانے میں صرف کرتے ہیں تاکہ
ہر لقمہ کے پورے مزے سے اُن کی زبان لطف اندوز ہو جائے اور
ہر کھانے کے آب و نمک سے اُن کے نفس کو زیادہ سے زیادہ ممکن
تسکین ... عورت کی مجلس آرائی کا منشا

بھی ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ تفس کا "کیف"، شراب کے نشہ کی طرح دیر تک قایم رہے —— یہ سب سُن کر وہ کہنے لگی :۔ کس ملک کے جانور ہو؟ لطف صحبت میں وقت ضایع کریں تو پھر فاقے کیا کریں۔ تم جیسے آنے والے کوئی جاگیر یا جائداد تو ہمارے نام لکھ نہیں جاتے —— میں نے کہا :۔ خفا کیوں ہوتی ہو مس صاحب، انسانوں کی طرح غصّہ نہ کرو، تم انسان ہی کب ہو تجارتی مشینیں ہو! مشین کو غصّہ نہیں آیا کرتا! "ہاں! ہم انسان نہیں"! اُس نے کہا "ہاں! ہم انسان نہیں، مگر کس نے حیوان بنایا؟ دُکاندار وہی مال تو دُکان پر رکھتا ہے جس کے گاہک آتے ہوں، یہ نہ کرے تو دُکان کیونکر چلے! تم حیوانوں کا جو کچھ مذاق ہے اُسی کے مطابق ہم اپنی دُکان سجاتے ہیں۔ ایک دن میرے گھر بیٹھ کر تماشہ دیکھو، کیسے کیسے "سیٹھ" یہاں آتے ہیں۔ میں کبھی بھول کر دو باتیں شروع کر دیتی ہوں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں، گھبرا کر بھاگتے ہیں۔ تم "مجلس آرائی" کی توقع کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ میرے خریدار اس طرح میرے پاس آتے ہیں کہ گویا سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدنے آئے تھے! ——"

ایک دن ایک مغربی "خاتون" سے ملاقات ہوئی، کہنے لگی ہمارے ملک میں جس شغل کو تم محبّت اور عیش کہتے ہو وہ بھی تجارتی

زندگی کے سانچہ میں ڈھل گیا ہے۔ بڑے سے بڑے سودے کم سے کم وقت میں طے ہوتے ہیں ——— اصل سوال وقت کا ہے، نہ مرد کے مذاق کا ہے نہ عورت کے! اور ہو بھی کیا؟ ہر شخص مصروف اور عدیم الفرصت ہے! ایسی زندگی کے نظامِ اوقات میں ہر شغل کے لیے نپا تُلا وقت مقرر ہے، یہ نہ ہو تو مرد بھی فاقے کریں اور عورتیں بھی! ———

ایک اور ملیں، اُن سے میں نے پوچھا، تم نے کبھی کسی مرد سے محبت بھی کی ہے، بیچاری میرا منہ تکنے لگی۔ "محبت؟" اُس نے کہا، میں تو دن رات میں چار چار مردوں سے محبت کرتی ہوں، جو کوئی میرے گھر آتا ہے اُس سے محبت کرتی ہوں، تیرہ برس کی عمر میں یہ پیشہ اختیار کیا ——— اختیار کرایا گیا ——— اُس وقت سے میں نے یہی سیکھا کہ ہر مرد جو آئے اُس سے "محبت" کرنی چاہیے جب تک وہ ٹھہرے، دس منٹ، دو گھنٹے، یا دو مہینے، میں نے کہا۔ عجب بیوقوف ہو، میں ایسی محبت کا ذکر نہیں کرتا، اصلی محبت، اصلی! ہنسنے لگی "کیا محبت کی بھی قسمیں ہیں؟ اصلی بھی ہوتی ہے اور نقلی بھی؟" میں نے کہا بیوقوف چھوکری! وہ ہنستی رہی، پوچھا جب، یہ نئی بات سُنی، محبت کی بھی دو قسمیں! اصلی بھی اور نقلی بھی! جیسے میرا زیور، بہت سا نقلی ہے، اور کچھ

اصلی ہے۔ آپ کے ملک میں دو قسم کی محبت ہوتی ہے، واہ سیٹھ، واہ! خوب ہنسی، خوب ہنسی، میں بھی ہنسا، ہنستا نہ تو کیا کرتا، کچھ عبرت بھی ہوئی، شرم بھی آئی، پھر میں نے کہا مجھے کیا، میں نے عورتوں کی ہمدردی کا ٹھیکہ تو لیا نہیں، جب وہ جانتی ہی نہیں کہ محبت کیا ہے تو اچھا ہے نہ جانے! ——————

۱۶ر جولائی

ایک دن بمبئی میں ایک صاحب بہت ہی گھبرائے ہوئے آئے، کہنے لگے سُنا آپ نے ؟ نجومیوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ۱۸ر تاریخ کو پھر بہت بڑا زلزلہ آنے والا ہے جس کا رُخ زیادہ تر بمبئی کی طرف ہوگا۔ اب کیا کرنا چاہیے جناب ؟ میں نے کہا غلطی تو آپ ہی لوگوں کی ہے اب صلاح لینے سے کیا فائدہ ؟ وہ کہنے لگے خدا کے لیے! ہماری کیا غلطی ہے ؟ میں نے کہا، سارے مکانات آپ لوگوں نے زمین پر بنا ڈالے، یہ غلطی کچھ کم ہے ؟ اگر پہلے ہی سے اپنے مکانوں کو زمین سے دو گز اوپر بناتے تو پھر زلزلہ آیا کرتا، زمین ہلا کرتی آپ بے فکر رہتے! آخر مکانوں کو زمین سے چپکا کر بنانے ہی کی کیا ضرورت تھی ؟ بیچارے سمجھے کہ میں نے کوئی پتہ کی بات کہی، سوچنے لگے، پھر دوسرے لوگوں کو مسکراتے دیکھ کر

کچھ سمجھے، کہنے لگے، واہ صاحب واہ، یہاں تو جان پر بن رہی ہے اور آپ کو دل لگی سوجھی ہے! ——

جان! بہت ہی قیمتی چیز سمجھی جاتی ہے جان! —— حالانکہ وہ انسان کے وجود میں سب سے کم قیمت چیز ہے۔ جو چیز اپنی نہ ہو اپنے قابو کی نہ ہو، اس کی قیمت ہی کیا۔ لیکن ایک دنیا ہے کہ اس "جان" کو اپنی "جان" سمجھ رہی ہے باوجودیکہ یہ بھی خبر نہیں کہ وہ ہے کیا، کہاں ہے، کہاں سے آتی ہے کہاں جاتی ہے۔ جب وہ جانے لگتی ہے تو ایک لمحہ بھی آپ اس کو روک نہیں سکتے! پھر بھی وہ آپ کی ہے!! —— سچ پوچھیے تو انسان کی جنس کائنات میں احمق ترین جنس ہے، سراپا حمق کامل! پھر اس پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ! دعویٰ دنیا کی خلافت اور حکومت کا! حالانکہ حکومت کا تو یہ حال ہے کہ اپنے ہی جسم کی ایک انگلی پر قابو نہیں! سائنس ہے، طب ہے، علوم عقلی و نقلی ہیں، کہیں کرۂ ہوائی کو فتح کیا جا رہا ہے، کہیں سمندروں کی بادشاہت کا اعلان ہے، کہیں لوہے اور بجلی کے مصنوعی انسان بنائے جا رہے ہیں، کہیں کتوں اور خرگوشوں کو مار کر زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، کوئی مریخ تک سفر کرنے کا تہیّہ کر رہا ہے، کوئی انسان کی عمر طبعی میں اضافہ کرنے کی تدبیروں پر غور کر رہا ہے —— لیکن —— کرۂ ہوائی اور سمندر کے

بادشاہ سلامت اور مریخ کے مسافر، سب کا دم پیٹ سے نکل جاتا ہے اور لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں ——— دیوانے، بے وقوف، گدھے !!

۱۷ر جولائی

شام میاں اختر بہت ہی سنجیدہ صورت بنائے ہوئے آئے۔ مجھ سے کہا کچھ مشورہ کرنا ہے، تخلیہ میں ——— اُن کی سنجیدہ صورت دیکھ کر میں تو سمجھا کسی نئی مہ پارہ کی خبر لائے ہوں گے، لیکن وہ اپنی حماقت کا ایک نیا شگوفہ لے کر تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے میری والدہ کی رائے ہے کہ میں شادی کر لوں تمہاری کیا رائے ہے؟ میں نے کہا معاف کرنا، اگر آپ کی والدہ یہ فرمائیں، کہ میری (یعنی اُن کی) یہ رائے ہے کہ میں (یعنی وہ) شادی کر کے اپنی بیوگی اور آپ کی یتیمی کا زمانہ ختم کر دیں تو زیادہ مناسب ہوتا! مگر یہ کیا کہ شادی آپ کی اور رائے والدہ کی ؛ دُنیا میں انسان کو موت ایک دفعہ نہیں آتی، دو دفعہ آتی ہے۔ آدھا پہلی چوٹ میں مرتا ہے اور باقی آدھا دوسری چوٹ میں۔ پہلی موت تو وہ ہوتی ہے جب اُس نے ازدواج کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈالی سمجھیے کہ جوانی اور نصف زندگی کا خاتمہ ہو گیا ——— اور خاتمہ بھی بالخیر

نہیں! شب عروسی سے بڑھاپے کا دور شروع ہوتا ہے، یعنی دوسری اور آخری موت کی تمہید! تم دیوانے تو نہیں ہو گئے کہ عین جوانی میں شادی! اپنی والدہ سے کہو میرا بیاہ رچانا ہے تو کچھ دن اور زندہ رہیے، چالیس برس کی عمر ہو جائے، قویٰ ہونے لگیں سست، چلنے پھرنے اور اُٹھنے بیٹھنے میں ہانپنے لگوں، تب وقت آئے گا کہ میرا سہرا تیار کیا جائے۔ ابھی تو اِن باتوں کی فرصت نہیں! کہا کیوں نہیں تم نے؟ اختر کہنے لگا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ تیری اولاد دیکھنے کی بہت تمنا ہے اور زندگی کا اعتبار نہیں، ــــــ زندگی کا اعتبار نہیں! یہ تو تمھاری والدہ کی بالکل جدید تحقیقات ہے، میاں اختر! ۸۰ برس اس دُنیا میں گذرنے کے بعد اُن کو معلوم ہو گیا کہ زندگی اعتبار نہیں!! تمھاری والدہ تو لقمان کی والدہ سے کم نہیں۔ ــــــ اب رہا اولاد کی تمنا کا سوال، تو مرد خدا! صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتا کہ اولاد کی اب کیا کمی ہے جو اُس کے لیے شادی کی جائے۔ تیرے کتنے ہی بچے گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہوں گے، اُن میں سے ایک پکڑ کر لے جا اور دکھا دے۔ لو اماں! اولاد تو یہ موجود ہے ــــ میری جوانی کی محنتوں کا زندہ نتیجہ! دو چار پوتی پوتے اُن کے حوالے کر دے، بیٹھی پالا کریں ـــــ اختر نے کہا، تم اس وقت اپنی طبعی "سنک"

میں ہو، جانے دو اس ذکر کو۔ میں نے کہا، یہ تو نہ ہوگا، تُو نے اب ذکر چھیڑا ہے تو سُن! شادی کے متعلق تجھے میرے خیالات معلوم ہیں، اب میں کہتا جاؤں تو لکھتا جا، جا کر اپنی امّاں جان کو سُنا دینا

۱۸ر جولائی

کل جو اختر نے اپنی شادی کا ذکر چھیڑا اور میں نے کی حضرت کی مزاج پُرسی شروع کی تو بھاگے، مگر میں کہاں جانے دیتا ہوں، پکڑ بٹھایا اور کہنی اَن کہنی سب ہی کہی! کیسے فرماں بردار فرزند ہیں بیچارے! امّاں کہتی ہیں بیاہ کر لے، سعادتمند کہتے ہیں، بہت خوب امّاں! ــــــ امّاں کہیں جا بیٹے کنوئیں میں ڈوب مر، یا تھوڑی سی سنکھیا کھا لے، یا اپنی ناک کٹا کر بازار میں ناچ تو بھی فرزند دلبند شفقت مادری کے جواب میں فرماں برداری پر کمربستہ ہو جائیں گے؟ واہ رے ہندوستان جنت نشان کے بیٹو اور واہ ری یہاں کی امّاؤں!!!

ــــــ میں نے کہا، میاں اختر، جوانی میں بیاہ کرنا ایسا جیسے بکرے کی داڑھی پہ مہندی لگائی! آخر نکاح کا منشا کیا ہے؟ اگر منشا افزائش نسل ہے تو یہ بغیر نکاح اور برات کے بھی ممکن ہے،

اور اگر منشا "سماج" کا انضباط ہے تو وہ بھی "دو بول" پڑھ دینے پر منحصر نہیں، یہ سب باتیں تو اشخاص کی ذہنیت پر منحصر ہیں۔ اور ازدواجی پابندی تو اُس قدیم عہد کی یادگار ہے جب دو انسان بیلوں اور سانڈوں کی طرح ایک مادہ کے لیے لڑتے تھے، جب معمولی خانگی ضروریات میں سے ایک عورت بھی تھی، لیکن اب تو ضرورتیں بدل گئیں، اُن ضرورتوں کو پورا کرنے والی اشیا کی نوعیت بھی بدل گئی۔ اب اپنے گھر میں روشنی کرنے کے لیے کوئی شخص نہ بازار سے تیل لاتا ہے نہ چراغ جلاتا ہے، بجلی کا ایک ہی تار سارے شہر میں پھیلا ہوا ہے اور ہر شخص ایک بٹن دبا کر اپنی ضرورت رفع کر لیتا ہے۔ زیادہ متمدن دُنیا کے لوگ تو گھروں میں باورچی خانہ کا دھندا بھی ناپسند کرتے ہیں، بھوک لگی، سرِراہ ہوٹل میں گئے، کھا لیا! حقّہ بھرنے، تازہ کرنے، سلگانے کا جھگڑا ہی ختم ہوگیا، سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ہے! ——————

رہا اولاد کا سوال تو —— میں نے کہا —— بیوقوف! اگر تازے تازے پھل بازار میں بکثرت میسر آسکتے ہوں تو باغ لگانا، درختوں کا پرورش کرنا اور آبیاری کی دردسری برداشت کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟ پہلے لوگ مچھلیاں پکڑنے دریا پر جاتے تھے۔ دن بھر کی سردی یا گرمی کی تکلیف اُٹھاتے تھے تب رات کو

ایک مچھلی پکڑ کر کھاتے تھے، اب پکڑی پکڑائی مچھلیاں، اچھی سے اچھی، ٹین کے ڈبوں میں بند، جہاں چاہو خرید لو اور کھالو، پھر جو تم دریا کے کنارے بیٹھ کر اونگھو تو تم سے زیادہ گدھا کون؟ رہا غلّہ، سو غلّہ یا پھل پیدا کرنے کے لیے یہ کیا ضرور ہے کہ زمین کی زمینداری کے تمام حقوق بھی حاصل کیے جائیں!! —— میں نے کہا —— اپنی امّاں سے کہیو کہ امّاں جانی! غلطی یہ ہوئی کہ آپ اپنے زمانہ کے بعد بھی زندہ ہیں، قافلہ جا چکا، اور آپ پیچھے رہ گئیں، اب دو وقت روٹی کھائے جائیے اور اپنے دن گذارتی رہیں۔ جس دریا میں تیر نہ سکیں اُس کے پانی سے دُور ہی رہیں!

—— درحقیقت انسانوں کی زندگی کی بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ اُن کا زمانہ گذر جاتا ہے، ماحول بدل جاتا ہے، اور وہ باقی رہ جاتے ہیں۔ آخر عمر میں وہ تو پُرانے ہوتے ہیں اور دُنیا نئی، کہاں جائیں، کیا کریں، کوئی اُن کی بات نہیں سمجھتا، نہ وہ کسی کی بات سمجھیں —— اُن کو پہچانتا نہیں، نہ وہ کسی کو پہچانیں! —— اُلّو کی طرح کسی ویرانہ میں بیٹھے اُونگھا کرتے ہیں۔ نئی دُنیا اُن کی سمجھ میں آتی نہیں اور جب وہ خواہ مخواہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگ اُن پر ہنستے ہیں اور اُن کی خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ہنستے ہیں!! —— میں نے کہا

اختر، نکاح اور ازدواج کی پابندیاں عہد قدیم کی تاریکیوں کی یادگار ہیں، مہذب دُنیا اب لغویات سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور جنگ عظیم کے بعد تو عورت اور مرد کے جنسی اور اجتماعی تعلقات کا ایک بالکل نیا تجربہ رُوس میں کیا جارہا ہے، وہاں خانگی اور خاندانی پابندیاں یکسر مٹائی جارہی ہیں اور زندگی کا سارا نقشہ بدلا جارہا ہے، تم پڑھے لکھے نوجوان ہو، تم کو سمجھنا چاہیے کہ عہد جدید کے دروبست میں تمھاری امّاں جان کا وجود محض بے ضرورت بلکہ ایک حد تک خارج اور مُخل ہے، یہ مجبوری ہے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنے پر اصرار کرتی ہیں، لیکن سانس لینے اور رُوٹی کھانے کے علاوہ اُن کے تمام حقوق ساقط ہو چکے، اس قسم کے ماں باپ اس زمانہ میں چھٹی اُنگلی یا ”اپینڈی سائیٹس“ کی طرح ہیں —— بیکار مگر موجود! —— اختر کہنے لگا، خدا کے لیے اس لکچر کو ختم کرو، میں نے کب کہا تھا کہ بیاہ کرتا ہوں، میں نے تو کہا تھا کہ امّاں کا یہ خیال ہے —— مگر —— وہ کہنے لگا —— میں نے تمھاری زبان پکڑی، اگر مگر کچھ نہیں! میں سمجھتا ہوں، تمھارے منتشر دماغ میں جو احمقانہ خیالات آرہے ہیں! میاں بیوی کی الفت کے خواب اگر تم دیکھ رہے ہو تو یاد رکھو، میاں بیوی صرف وہی خوش رہتے ہیں جن کے تعلقات میں اُس اصطلاح کا دخل

نہ ہو جس کو ــــــ محض اس لیے کہ کوئی دوسرا لغو تر لفظ میسر نہیں آتا ــــــ "محبت" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورت اور مرد کے تعلقات اُسی وقت تک پُر کیف ہوتے ہیں جب تک کہ اُن دونوں کے درمیان نکاح کا واسطہ قائم نہ ہو جائے!! ــــــ اگر ایک دروازہ سے قاضی صاحب نکاح پڑھانے تشریف لاتے ہیں تو یقین جانو کہ دوسرے دروازہ سے سارا لطف زندگی نکل کر بھاگتا ہے!! عورت جب تک خالص عورت ہے اور مرد جب تک خالص مرد ہے، ــــــ نہ وہ بیوی ہے اور نہ یہ شوہر ــــــ اُسی وقت تک زندگی میں مزا ہے اور جب "قبول کیا میں نے اُس کو" درمیان میں آیا تو دو اچھے خاصے انسان میاں بیوی بن کر رہ گئے ــــــ خشک، چڑچڑے، لڑاکا، بیمار، آزاری، مکھیاں بھنکتی ہوئی، مُنہ ٹیڑھے، ــــــ اختر کچھ گرمائے، کہنے لگے، جو مُنہ میں آئے بکے جاؤ، مگر ہمیں تو یاد ہے، ابھی دو تین ہی مہینہ ہوئے کہ تم "لیلیٰ" سے نکاح کرنے کے لیے مرے پھرتے تھے، اُس وقت کہاں تھا یہ فلسفہ، اور کہاں تھیں یہ موشگافیاں؟ ــــــ میں نے کہا ــــــ عارضی دیوانگی قانون کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے، اُس حالت میں لوگ خودکشی کر لیتے ہیں، قتل کر ڈالتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں، اینٹیں مارتے ہیں ــــــ وہ سب عقل کا فتور ہے ــــــ یہ کیا دلیل لائے تم ــــــ

اختر ہنس کر کہنے لگا، اگر وہ دیوانگی کا دورہ تھا، تو پھر بھی ہوسکتا
ہے وہ دورہ! کسی دن دورہ پڑیگا ایک گھروالی گھر میں لاکر
بٹھا [illegible]، پھر ہم کریں گے ستّر سلام! —— میں نے کہا بھاگ!
[illegible]

۲۹ر جولائی

قدموں کی آواز پہچانتا ہوں —— مطلوب و
مقصود جب اونچی ایڑی کی جوتیاں پہنے کھٹ کھٹ کرتا آتا ہے تو
میں دور سے پہچان لیتا ہوں کہ یہ کھٹ کھٹ جانکی بائی کی ہے یا
رادھا بائی کی، یا زبیں جان کی! مگر جب قدموں کی آواز ہوتی ہے
کھڑ کھڑ، تو مرے اعصاب پر چوٹ لگتی ہے، اور متلی شروع ہوجاتی
ہے —— اب وہ آرہے ہیں! —— میز پر سے گلاس ولاس
اُٹھا کر پلنگ کے نیچے رکھ دیتا ہوں، کوئی بی صاحب جلوہ افروز
ہوتی ہیں تو اُن سے کہتا ہوں، نیک بخت ذرا دوسرے کمرہ میں
چلی جاؤ، اپنا پاندان بھی لیتی جاؤ، اب آمد تیمم برخاست! ——
اس طرح وہ تشریف لاتے ہیں —— مولانا خیرالزماں صاحب
—— جب وہ آتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے —— کیا
بتاؤں، کیا چاہتا ہے! مولانا کھانستے، کھنکارتے، گلے کے بلغم کی

ڈھیریاں سارے صحن میں اور سبزٹھیوں پر جماتے، پیک کی پچکاریاں مارتے، داڑھی کھجاتے تشریف لاتے ہیں ——— السلام وعلیکم ——— ابتدا اس دُعا سے ہوتی ہے ——— سلامتی ہو تم پر

مذہب، مذہب! مکر، مکر! مغرب ہو یا مشرق، ہر جگہ وہی زور، حیلہ اور فریب، ! یہ سب ہماری زندگی کے جزو لاینفک ہو کر طبیعت ثانیہ ہو گئے ہیں۔ کچھ مذہب نے سکھایا کچھ تمدّن نے۔ مگر اہلِ مذہب پر زیادہ الزام اس لیے ہے کہ وہ صداقت اور پاکی کے مدعی ہو کر مکر و زُور کے مرتکب ہوتے ہیں "السلام علیکم" کہتے ہیں اور اُس کے ساتھ "ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" بھی مگر جو زبان سے کہتے ہیں اُس کے بالکل برخلاف دل میں ہوتا ہے۔ زید سے ملاقات ہوتی ہے، دل کہتا ہے مر جائے یہ شخص، تباہ ہو جائے یہ شخص، تباہ ہو جائے، مٹ جائے اور زبان کہتی ہے "سلامتی ہو تم پر"! دل کہتا ہے اس کو زہر بھرا ایک پیالہ پلادو، زبان کہتی ہے "عمرت دراز"!! دل کہتا ہے اس مردود کی بوٹیاں نوچوں، زبان کہتی ہے۔ "خدا سلامت رکھے"!!! یہ حقیقت ہے اُس پاکیزگی نفس اور خلوصِ قلب کی جس کی تعلیم مشرق میں مذہب اور مغرب میں "معلم اخلاق" دیتا ہے! دل کی بد دعائیں زبان پر دعائیں بن کر آئیں اور زہر

شربت کی شکل میں پیش کیا جائے ــــــــ اس کا نام ہے
اخلاق حسنہ!! ہمارے مولانا "السلام وعلیکم" کہتے ہوئے آتے
ہیں اس لیے کہ ان کو اپنے مدرسہ کے لیے مجھ سے چندہ لینا ہے، ہم
"وعلیکم السلام" کہہ کر مصافحہ کرتے ہیں اس لیے کہ ابھی تک مذہب
اور عاقبت کا ایک بے معنی خوف ہمارے دلوں میں باقی ہے
ــــــــ عقل کہتی ہے کہ مذہب محض ایک ڈھونگ ہے
مگر کمزور دل لرزتا ہے کہ جنت دوزخ کی باتیں کہیں واقعی صحیح،
نہ ہوں! کہیں مرنے کے بعد سچ مچ دوزخ کی کھڑکیاں قبر میں نہ کھل
جائیں! ہم سے تو وہی بیوقوف اچھے جو آنکھیں بند کر کے مذہب
کی پیروی کرتے ہیں یا وہ اچھے جو صاف صاف مذہب کے منکر
ہیں۔ اُن کو کچھ بھی نہیں تو ایک قسم کی یکسوئی تو حاصل ہے۔ ہم
لوگ تو ادھ بھر میں معلّق ہیں ــــــــ نہ تیتر نہ بٹیر!! ــــــــ
اصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی اتنے
جالوں اور پھندوں میں پھنسا دی گئی ہے کہ اُن جالوں کے
کتنے ہی خانے توڑ ڈالو پھر بھی پھندے باقی رہ جاتے ہیں۔ درس
اخلاق سب مذاہب دیتے ہیں، مگر مذہب والوں میں عمل کی
توفیق کم پیدا ہوتی ہے ــــــــ "وعلیکم السلام" مولانا، تشریف
لائیے ــــــــ میں نے کہا ــــــــ دل کہتا تھا یہ بیوقوف کیوں میرے

اوقات کو خراب کرنے نازل ہو گیا) تشریف لائیے، بہت دنوں بعد آپ کا دیدار ہوا! ـــــ حضرت تشریف لائے، بیٹھے، دو تین پان منہ میں ٹھونسے، اگالدان کو بلغم سے بھرا، پھر کہنے لگے ـــــ کیوں میاں! تم نے کبھی تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کیا ہے، نفسیات کے نقطۂ نظر سے؟ میں نے کہا، جی ہاں، میں دُنیا کی تمام بڑی اقوام کے نفسیات کا مطالعہ کر چکا ہوں، فرمایا، تم نے مسلمان اور دیگر اقوام کی نفسیات میں کیا فرق پایا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں! سب یکساں ہیں، جو عیب ایک میں ہے وہ باقی سب میں بھی ہے ـــــ کم و بیش ـــــ اشکال مختلف ہیں، ماہیت ایک ہے۔ کہنے لگے ـــــ ہاں! پھر تم نے کیا خاک مطالعہ کیا! میاں اسلام کی تعلیم کو دیکھو اور دوسرے مذاہب کی تعلیم کو، زمین آسمان کا فرق ہے! میں نے کہا ہوگا، الفاظ مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، اسلوب بیان بھی مختلف ہے مگر اچھی باتیں اور بُری باتیں سب مشترک ہیں البتہ ایک چیز سب ہی میں مشترک ہے ـــــ کہنے لگے ـــــ وہ کیا؟ میں نے کہا وہ یہ کہ عمل خیر کی طاقت و استعداد کسی میں نہیں، مگر، تصنع سب میں ہے، اچھی باتیں جو ہیں وہ بے اثر ہیں، بُری باتیں عام ہیں! پادری، راہب، اسقف، پنڈت،

اور مولانا، لباس بکر سب کے جسم پر ہے۔ دل میں کچھ ہی ہو
عمل میں ضعف ہے اور تصنّع! اِن نفسیات کے متعلق میرا مطالعہ
تو صرف اتنا ہے کہ سب کے سب نفس کے بندے ہیں ——
سوائے اُن چند کے جو دُنیا سے قطع تعلق کر کے ہمالہ کی کسی غار میں
مُنہ چھپائے پڑے ہوں —— سو راستہ اُن کا بھی صحیح نہیں۔
وہ کوہ نشین معتکف ہم سے بھی زیادہ بُزدل ہیں ——
دُنیا کو سنبھال نہ سکے تو دُم دبا کے بھاگے!! —— مولانا
کھلے ہیں! حجت شروع کرنے سے پہلے کھا نسا کرتے ہیں ——
بھائی میرے! —— وہ بولے —— پھر کیا تم دہریہ ہو گئے،
لامذہب ہو گئے؟ میں نے کہا حضرت! نہ دہریہ ہوں نہ لامذہب،
مسلمان ہوں بالکل ایسا ہی جیسے سب ہیں —— فرق صرف اتنا
ہے کہ وہ کہتے نہیں میں صاف صاف کہتا ہوں!! دونوں عیدوں
کی نماز عیدگاہ میں پڑھتا ہوں، گائے کا گوشت کھاتا ہوں، بہت
سخت قسم کا ہمدردِ قوم ہوں، یعنی یہ حال ہے کہ قطب شمالی پر
اگر کسی مسلمان بھائی کے اسلامی ناک میں ٹھنڈی ہوا گھس
جاتی ہے تو مجھے اپنے آتشدان کے سامنے چھینکیں آنے لگتی ہیں!!
اگر ٹمبکٹو میں کسی مسلمان کا پاؤں پھسل جاتا ہے تو یہاں میرے
جوتے میں اتنا تکلیف وہ کیل نکل آتی ہے! مسلمانوں کو میں

"خوابِ غفلت" سے بیدار کرنے کا اسلامی فرض بھی عنقریب انجام دینے والا ہوں ـــــ ذرا جوانی کے کاموں سے فارغ ہولوں، بڑھاپے کا گھنٹا بجتے ہی لیڈرِ قوم بن جاؤں گا، تمام مُردوں کو قبروں میں بیدار کردوں گا ـــــ مولانا! بڑے ارادے ہیں میرے! ـــــ پھر میں نے کہا ـــــ لفافہ خالی ہے مولانا، اِس پر کیوں مُہریں لگائی جارہی ہیں ـــــ گھوڑا مُردہ ہے، ناحق آپ لوگ کوڑے مار رہے ہیں ـــــ روٹی کمائی کسی نہ کسی طرح، کچھ "کارِ خلوت" بھی کیے جائیے ـــــ چاہے مذہب کی آڑ میں، چاہے ہم رندانِ بلاکش کی طرح ـــــ جب وقت آئے چلے جائیے ـــــ جہاں سے آئے تھے ـــــ معلوم نہیں کہاں سے آئے تھے ـــــ باقی سب جھگڑوں کو چھوڑئیے ـــــ

مولانا نے گفتگو کا رُخ بدلا۔ کہنے لگے، تم نے سُنا شہر میں طاعون شروع ہوگیا ـــــ میں نے کہا الحمدللہ! پانچ سات برس میں جب ایک دفعہ حضور وائسرائے یا گورنر بہادر اس طرف آجاتے ہیں تب تو شہر کی سڑکیں درست ہو جاتی ہیں اور نالیاں دُھل جاتی ہیں، اسی طرح دو چار برس میں جب طاعون آتا ہے تو بھی شہر کی صفائی کا کچھ انتظام اور اہتمام ہوجاتا ہے۔ اِن ہی

دو کی وجہ سے شہر کی غلاظت کی مقدار کبھی کبھی کم ہوتی رہتی ہے!!
الحمد للہ نہ کہوں تو کیا کہوں! ـــــ مولانا کہنے لگے ـــــ میاں
تم سے بات کوئی کیا کرے۔ اُلٹی کہتے ہو، سیدھی تو کہتے ہی نہیں۔
اچھا یہ بتاؤ طاعون کا ٹیکہ لگوایا جائے یا نہیں؟ میں نے کہا: حضرت
مولانا! اِس زمانہ میں اُلٹی باتیں ہی سیدھی ہیں! سیدھی بات
بیوقوفی کی بات ہے! ٹیکہ کی ضرورت آپ کو بالکل نہیں، مجھے ہے،
کہنے لگے یہ کیوں؟ میں نے کہا! آپ پچاس کی عمر سے گذر چکے اور
میں ابھی تیس کی منزل پر بھی نہیں پہنچا۔ آپ کے انتقال سے
دُنیا کا کوئی نقصان نہ ہوگا اور میں ابھی گاڑی کھینچنے کے قابل
ہوں، فطرت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہوں، مجھے کچھ روز
ٹھہرنے دیجیے، آپ آگے جائیے! در اصل ہم اور آپ فطرت کے
رازوں سے واقف نہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً وباؤں، طوفانوں،
زلزلوں اور جنگ و جدل کے ذریعہ سے گھر کی صفائی کرتی رہتی
ہے۔ اُس کے جھاڑو میں جس قدر خاشاک آجاتی ہے اس کو
اپنے کوڑہ گھر میں پھینک دیتی ہے۔ اُس جھاڑو کا مقابلہ زمین پر
پھیلے ہوئے تنکے نہیں کر سکتے۔ طاعون ایک بہت معمولی اصطلاح
ہے، اُس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، بلکہ دو چار دن کا
بخار اور گلٹیوں کا درد اِس سے تو بہتر ہے کہ ۷۰ برس کی عمر میں

آپ ذیابیطس، گٹھیا، ضیق النفس، سلسل البول اور خدا جانے کتنی بلاؤں میں گرفتار ہو کر ایڑیاں رگڑیں اور آپ کے اہل وعیال تیمار داری کرتے کرتے پریشان ہو جائیں، دوست احباب عیادت کرتے کرتے تنگ آجائیں، اطبا نسخے لکھتے لکھتے تھک جائیں اور بڑی مشکل سے آپ کی روانگی کا وقت آئے ——— بیل گاڑی کا سفر کیوں کیجیے جبکہ آپ ایکسپریس یا طوفان میل میں سوار ہو کر جا سکتے ہیں!! ———

ہمارے مولانا ہنس دیے، میں بھی ہنس دیا۔ ——— پھر وہ اپنے بچے بچوں کا ذکر کرنے لگے، یہ تذکرہ اُن کو بہت عزیز ہے۔ اور ماشاءاللہ بچوں کے متعلق مولانا کا نظام الاوقات بھی بہت مرتب اور منظم ہے۔ ہر گیارہویں مہینہ کے شروع اور آخر میں ۴۴ کروڑ میں ایک اضافہ مولانا کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اُس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی! نیکبخت ملانی جی مولانا سے اس معاملہ میں پورا تعاون کر رہی ہیں۔ دیکھیے کب تک مولانا کا یہ خیر جاریہ قایم رہتا ہے! ———

بچے مولانا کے سب بہت حسین ہیں ——— کوئی کانا، کوئی کالا، کوئی بہرا، کوئی گنجا! ——— مگر مولانا کو اس کی ذرا بھی پروا نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اُن کے بعد وہ سب اُسی خاندانی مسند رشد و

ہدایت پر جانوس کریں گے اور جب تک جبّہ و عمامہ کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی ہے ایک آنکھ، یا ایک ٹانگ یا دو ٹانگ کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا! اللہ کے خاص بندے فانی اور جسمانی حُسن صورت کے محتاج کب ہوتے ہیں اور یہی کافی ہے ——
—— غرض یہ کہ مولانا نے دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایا، جب میں ستار لے کر بیٹھا اور مولانا سے کہا کہ سُنیئے کوئی گت، تو وہ لاحول پڑھتے ہوئے اُٹھ گئے!

۹ر اگست

پرسوں رات، کل رات، گذشتہ رات، تین دن مسلسل اُس دُنیا میں نہ تھا جو اخلاق و آداب اور احتیاط و اعتدال کی دُنیا ہے۔ بلکہ اُس دُنیا میں تھا جہاں احتیاط اور اعتدال عیب ہے، جہاں نہ ماضی ہے نہ استقبال، حُسن ہے عشق ہے اور حال ہے!! آج ذرا پلنگ پر پڑا ہوا تکان دور کر رہا ہوں —— کاش کہ عیّاشی میں تکان ہوا ہی نہ کرتی!!
اُن تین راتوں کا خمار ہنوز سر میں ہے اور تصوّر کا دامن ہاتھ میں۔ ایک عورت پھر میرے اندر ایک تازہ "طلب" پیدا کر رہی ہے —— کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے! میں ابھی پڑا ہوا سوچ

رہا تھا کہ اگر میرے ساتھ حسن کی آویزشوں کا سلسلہ "لیلیٰ" کے واقعات کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے تو پھر اِس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ "لیلیٰ" کے متعلق میری وارفتگی جس کو میں اُس وقت محبت سمجھتا تھا طلب عیش کے چڑھتے ہوئے دریا کی صرف ایک موج تھی ـــــ اور کچھ بھی نہیں۔ کیا میں دھوکہ کھا رہا تھا جب یہ سمجھتا تھا کہ اِس عورت نے پہلی مرتبہ میرے قلب پر محبت کی خاتم سلیمانی ثبت کی ہے اور وہ چیز مجھے دے دی ہے جس کو اہل دل "عشق و محبت" کہتے ہیں؟ دُنیا کا ہر کوتاہ نظر ظاہر پرست یہی کہے گا کہ میری حسن پرستی کا یہ مسلسل دَور ہوس کا ایک ہنگامہ ہے۔ ہر چند روز میں ایک نئی عورت کی طلب اصطلاحی طور پر ہوس ہی ہوس کہی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس نکتہ کو بالکل دوسری طرح حل کیا ہے۔

انسانیت کا وہ جوہر لطیف وہ "برقیت" ـــــ محبت ـــــ ہر عیاش اور رند کے قلب میں موجود ہے اور عورت بہ عورت منتقل ہوتی رہتی ہے، یعنی ہر عورت جو اُس عیاش کے آغوش میں آتی ہے ایک شب یا چند روز کے لیے اُس "برقیت" کی حامل رہتی ہے پھر جب مرد کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ "برقیت" بھی اُسی طرف منتقل ہو جاتی ہے ـــــ

اور اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے ——— عورت بہ عورت ———
اپنی یہ منزلیں طے کرتی ہوئی وہ "برقیت" آخر اُس عورت تک
پہنچتی ہے جو اُس کی مقصود ہے اور وہیں مرکوز ہوکر رہ جاتی ہے
——— وہ اپنی آخری منزل پر پہنچنے کے لیے بہت سی منزلیں طے
کرتی ہے! پس یہ کہنا کہ ایک ہوس پرست عیاش نورِ محبت سے
محروم ہے اور اُس کے آغوش میں جو عورتیں آتی ہیں وہ بھی
محروم رہتی ہیں صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ سب ہی روزمرہ
کی محبت سے تھوڑا بہت حصہ پاتی ہیں مگر ہاں، اُن کے وجود
میں وہ محبت قیام نہیں کرتی، ——— گذرتی رہتی ہے
——— تاآں کہ آخری عورت تک پہنچے! ———
میری وہ آخری عورت کون ہوگی، معلوم نہیں ———
یا وہ آخری عورت "لیلیٰ" ہے (یادش بخیر) جس کی طرف میں
پھر لوٹنے والا ہوں؟ ——— معلوم نہیں!! اور یہ
بھی تو ممکن ہے کہ آخرکار میرے اس دریا کا سارا بہاؤ کسی
ریگستان میں جاکر خشک ہوجائے، گم ہوجائے، ختم ہوجائے!
اور میری "برقیت" کی یہ لہر کسی آخری نقطہ تک پہنچنے ہی
نہ پائے!! ——— ابھی تو یہ لفافہ ڈاک میں ہے ———
گذر رہا ہے ——— ایک تھیلی سے دوسری تھیلی میں، ایک ڈاکخانہ

سے دوسرے ڈاکخانہ میں !! ـــــــــــ

ایک دن اختر کو میں نے اپنی عیاشی کا یہ فلسفہ سُنایا، وہ کہنے لگا:۔ پڑھا لکھا پاپی اپنے پاپ کی توجیہہ و تاویل خوب کرلیتا ہے، مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لفافہ ڈاک میں چلتے چلتے یونہی ایک دن لاپتہ ہو جائے گا! کوئی ڈاکیہ کسی نالی میں پھینک دے گا، وہ نالی اُس لفافہ کو بہا کر چہ بچّہ میں لے جائے گی، کوئی خاکروب چہ بچّہ سے نکال کر اس کو کھاد میں شامل کر دے گا! ــــــــ نورِ محبّت کی شعاعیں بڑھاپے کی ظلمت میں فنا ہو جائیں گی! ــــــــ یا یہ "برقیت" اس طرح عورتوں میں تقسیم ہوتے ہوتے ختم ہو جائے گی، بارود گیلی، آتش خانہ سرد!! زندہ رہے تو ــــــــ وہ کہنے لگا ــــــــ ہم دیکھ لیں گے کہ جب گناہ کی طاقت باقی نہ رہے گی تو توبہ توبہ کرو گے، کسی نیک بخت لڑکی کو شریکِ زندگی بنا لوگے اور ممکن ہے کہ آخر عمر کی کمزور کوششیں ایک دو بچّے بھی پیدا کر لیں ــــــــ آپ بیٹھے ہوئے اونگھا کریں گے اور اپنے باپ دادا کی طرح اونگھتے ہی اونگھتے کسی دن چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہو جائیں گے ــــــــ کہاں کی "برقیت" اور کہاں کا نورِ محبّت!! میں نے کہا میاں اختر! تم جوان بھی ہو،

عیاشی بھی ہو، یہ سب باتیں اچھی ہیں، مگر تمھیں اس فن کی "عرفانیات" سے ذوق نہیں، اس کا افسوس ہے! تمھارے نزدیک انسان کی زندگی کا ایک نظام مکمل و مرتب ہے ——

پیدا ہوگا، جوان ہوگا، عیاشی کرے گا، بڈھا ہونے لگے گا، توبہ کرے گا، پھر ایک بیوی مہیا کرے گا، ایک دو بچے پیدا کر ڈالے گا، آخری عمر میں اللہ اللہ کرے گا —— اور مر جائے گا!! تم سمجھتے ہو کہ انسان کی زندگی بس اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیاتی زندگی کا دستور العمل نہ کبھی مرتب ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ انتشار اور اختلال ہی اس کی زندگی کی ترتیب و ترکیب ہے —— یہ تصویر ایسی نہیں کہ اس کو کسی چوکھٹے میں لگایا جا سکے۔ وہ چوکھٹے اور فریم میں سماتی ہی نہیں۔ سب کی دُنیا ایک نہیں، جتنے انسان ہیں اتنی ہی دُنیائیں ہیں، ہر انسان بجائے خود ایک دُنیا ہے، وہ اپنی دُنیا اپنے دل و دماغ میں لیے پھرتا ہے۔ پیدائش اور موت کے سوا دو انسانوں میں کوئی چیز مشترک نہیں اور یہ دو چیزیں بھی جو مشترک ہیں نہایت ہی خفیف اور معمولی ہیں —— جس طرح کتاب کے شروع اور آخر کا سادہ ورق، شمار میں آتا ہے، پڑھا نہیں جاتا!! زندگی کے ان دو معمولی حادثوں سے قطع نظر کر لو تو پھر کوئی انسان کسی

حیثیت سے دوسرے انسان کا شریک یا مثل نہیں ہوتا ــــــــ
البتہ ــــــ میں نے کہا ــــــ جذبہ ــــــ یعنی شہوت، محبت، غصّہ، رنج وغیرہ اس جنس کا ایک مشترک عنصر کہا جاسکتا ہے لیکن اس کی کارفرمائیوں اور مظاہروں کو دیکھو تو وہ بھی بالکل الگ الگ ہیں، ہر وجدان اور کیفیت جُدا جدا ہے، ــــــ
کیف اور رو طلب" مختلف ہے۔ جب یہ حال ہو تو انسان کی زندگی کا کوئی مشترک دستور العمل کیونکر مرتب کر سکتے ہو۔ لوگ سوانح عمریاں لکھتے ہیں، تذکرے لکھتے ہیں، سو دو سو چار سو صفحوں میں گویا ایک انسان کی زندگی کا بہت سا حال لکھ جاتے ہیں ــــ تاریخوں کے چند سو یا چند ہزار صفحات پر قوموں اور انسانوں کی بڑی بڑی داستانیں بیان کی جاتی ہیں ــــــ
گویا چھاپہ خانہ کی سیاہی اور کاغذ کے کاغذ سے عہد ماضی کی تاریکیوں میں چراغ روشن کر رہے ہیں!! مگر ــــــ میں نے کہا ــــــ آخر، کیا حقیقت ہے ان سوانح عمریوں، تاریخوں اور تذکروں کی؟ لفافے کے ظاہری نقش و نگار بیان کیے جاتے ہیں، لیکن لفافہ کے اندر نفسیاتِ انسانی کی جو تجلیات بے قرار رہتی ہیں اُن تک سوانح نگار اور مورّخ کا خیال اور قلم کبھی نہیں پہنچ پاتا؛ کسی ایک فرد واحد کی معنوی زندگی کے

ہجوم میں گھس کر اُس کے خصائص کو ایک ایک کر کے میدان میں لانا چاہو تو کیا تم لا سکو گے؟ خود اپنے اُوپر یا مجھ پر تجربہ کر کے دیکھو!! یا فرض کردہ زید کے معنوی زندگی کے کچھ نقوش قلم بند کرنا چاہتے ہو، اس کی ہر خصوصیت کے لیے ایک ایک باب مخصوص کر دو:۔

زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے۔

زید جب وہ شراب پیتا ہے۔

زید جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

زید جب وہ چوری کرتا ہے۔

زید جب وہ عورت کے قریب ہوتا ہے۔

زید جب وہ دوستوں سے ملتا ہے۔

وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ۔

اِس میں صرف ایک ہی جزو کو لے لو یعنی "زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے" قلم میں کچھ زور ہے اور زید کے متعلق کچھ بصیرت بھی ہے تو حقیقتِ حال لکھنا شروع کر دو۔ کتنے جھوٹ زید نے بولے، کہاں کہاں، کس کس سے اور کیوں؟ کتنے جھوٹ زید نے ایسے بولے جن سے دوسرے لوگوں کو شدید نقصانات پہنچے، کتنے ایسے بولے، جن کا منشاء اپنی عیب پوشی تھی، کتنے بے وجہ عادتاً بولے،

کتنے عورت پر قبضہ کرنے کے لیے اور کتنے اپنی بیوی کو دھوکا دینے کے لیے اور کتنے اپنی اولاد کو بہکانے کے لیے؟ ہر دفعہ جھوٹ بولتے وقت زید کے محسوسات کیا تھے، جذبات کیا تھے۔ کتنی دفعہ وہ جھوٹ بول کر پشیمان ہوا، اُس کے کتنے جھوٹ کامیاب رہے کتنے ناکام ———— وغیرہ وغیرہ وغیرہ

ساری عمر ایک اس باب ہی کے لکھنے میں ختم ہو جائے گی۔ اس محشر انتشار کا۔ جس کو انسان کہتے ہیں، دستور العمل کیا بنا سکتے ہو! دلّی کا فیلسوف شاعر خوب کہہ گیا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

اِس محشرِ خیال میں تم جیسے لاکھوں غوطے کھاتے ہیں اور یہ اس انتشار کے متعلق کچھ بصیرت رکھتے ہیں ———— میری طرح ———— وہ ہنستے بولتے گذر جاتے ہیں۔ میں دوسروں کی "انجمن" کے تلاش کرنے میں کیوں اپنی جان گھلاؤں ———— میری اپنی خلوت میری اپنی انجمن ہے! ہر انسان اپنے ساتھ ایک ایسی انجمن لیے پھرتا ہے ———— کون اس کی سوانح عمری لکھ سکے۔ کون اس کی معنوی زندگی کا لاکھواں حصہ بھی بیان کر سکے۔ سب کو اپنی اپنی راہ جانے دو، تم بھی بڑھے جاؤ ———— البتہ

اتنا کام کیجیو کہ اگر راستہ میں کوئی حسین عورت نظر آجائے تو اس کو سمجھا دینا کہ ان کا (یعنی میرا) گھر اس طرف ہے!! بات یہ ہے کہ میرے "انوارِ محبت" جن کی حامل فی الحال پرسوں رات والی ہیں عنقریب کسی اور طرف منتقل ہونا چاہیں گے!! ——— اختر ہنستا ہوا اور کہتا ہوا چلا گیا ——— ٹھہر جا! تو اور تیرا "نورِ محبت"! لاتا ہوں بلا کے مولانا خیر الزماں صاحب کو!! ———

۱۴ راگست

"گناہ کر، پکا پانی بن جا، رات دن کا فرق بھول جا، اور سر کو مستی سے بھاری کر کے خانۂ خدا میں لڑکھڑاتا ہوا جا ——— بھوکے کتے کو اپنے دروازہ سے لات مار کر بھگا دے، اور لمبی لمبی ڈکاریں لے کر نرم بستر پر سو جا! ——— "

ایک روسی شاعر کی نظم کا یہ ترجمہ میں رات بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اُس کم بخت نے اس قدر خوشگوار نظم کے آغاز کا انجام وطن پرستی کے جذبہ کو قرار دیا ہے اُس نے انسانی زندگی کے کیفِ تمام کی ایسی اچھی تصویر کھینچنی شروع کی، سارے خطوط صحیح اور متناسب

——— مگر آخر میں آسمان سے گرا سیدھا وطن پرستی کے
چہ بچّہ میں! لاحول ولا! میرے اُستاد نے ایک دن خوب کہا
تھا ——— مر گئے بے چارے، اس لیے کہ خوب کہنے والے
اکثر جلد مر جاتے ہیں ——— خوب کہا تھا اُنھوں نے! کہنے لگے
کہ ان تمام مذاہب کے پیرو اور علم بردار جو توحید کے مدعی اور
شرک کے دشمن کہے جاتے ہیں خود بدترین قسم کے بُت پرست
ہیں، کعبہ کے بتوں کو تو اُنھوں نے گرا دیا۔ سومنات کے بتوں کو
بھی توڑ ڈالا مگر ان مٹی اور پتھر کے مجسّموں سے زیادہ خونخوار
بتوں کی پُوجا شروع کر دی! اُن ہی میں سے ایک وطن پرستی
ہے۔ انسان اپنی زندگی کے بڑے سے بُرے جذبہ کو وطن پرستی
کا لباس پہنا کر نچاتا ہے۔ جن چیزوں کو اُس نے اپنے اخلاقی
دستور العمل میں بُرا اور معیوب قرار دیا ہے (میں تو خیر اس
دستور العمل کا قایل ہی نہیں) اُن سب کو وطن پرستی کے پردہ
میں روا رکھتا ہے۔ مثلاً میں جو کام کرتا ہوں ———
کار ہائے خلوت ——— وہی سب بلکہ اُن سے زیادہ وطن پرست
کرتا ہے مگر اپنی وطن پرستی کا نام لے کر! میں عیاشی کرتا ہوں،
مگر زمین کے قبضہ اور ملکیت کے لیے کسی کا گلا نہیں کاٹتا، وہ
ایک گز زمین کے لیے فوجوں کی صفیں آراستہ کر کے ہزاروں

لاکھوں انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح کاٹ ڈالتا ہے اور گھوا دیتا ہے!! میں عورت بازی کرتا ہوں ـــــ بغیر شرمائے اور چھپائے ہوئے ـــــ وہ بہانہ بازیاں کر کے، مکر اور فریب سے عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم کرتا ہے، پھر اپنے کو دنیا کا محسن اور محافظ قرار دیتا ہے!! میں زنا کرتا ہوں ـــ اس عورت کے ساتھ جو میرا پیسہ لے کر، یا بغیر اس کے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے مگر وہ دوسری قوموں کے گھروں پہ بغیر اُن کی اجازت کے قبضہ کر لیتا ہے اور پھر مفتوح اگر اُس کو ڈاکو کہے تو بغاوت کا مقدمہ چلاتا ہے!! میں شراب پی کر اپنے یار کو پیار کرتا ہوں وہ سپاہیوں کو شراب پلا کر درندہ بناتا ہے ـــــ اُس کے عیش کے دن میری عیش کی راتوں سے بہت مختلف ہیں!! زندہ باد وطن! پائندہ باد وطن! ـــ

میری تو کبھی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ دُنیا کے لوگ کیونکر ان پُر فریب اصطلاحوں سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ جہاں ایک حسین عورت پاس ہو، ایک صراحی شراب کی سامنے ہو وہاں میرا وطن ہے۔ مگر وطن پرست کا وطن ـــــ وہ ہے جس کے لیے وہ دوسروں کی عورتوں اور دوسروں کی

شرابوں کو چھپین کر لائے

میں روزانہ ایک دو اخبار پڑھ لیتا ہوں، لیکن طلاق کے مقدمات کی روئیداد یں پڑھتا ہوں، سینما اور تھیٹر کے اشتہارات پڑھتا ہوں، حسن و عشق کا کوئی قصہ ہو تو وہ پڑھتا ہوں مگر جب اس مطالعہ کے سلسلہ میں کوئی سُرخی نظر سے گذرتی ہے جیسے :-

"جاپان میں وبا"

"امریکہ میں سونے کے ذخائر کی کمی"

"رومانیہ میں بغاوت"

"اسپین میں دستوری حکومت"

"فرانس کی مجلس وزراء کا استعفیٰ"

تو صرف سُرخی پڑھ کر گذر جاتا ہوں، کبھی ان لغویات میں اپنا وقت ضایع نہیں کرتا!! اگر فرانس کی وزارت نے استعفیٰ دے دیا، یا اگر رومانیہ میں بغاوت ہو گئی، یا اگر امریکہ میں سونے کے ذخائر کی مقدار کم ہو گئی تو میں نے کیا قصور کیا ہے کہ میں اس آدھے یا سوا کالم کے پڑھنے میں اپنا وقت ضایع کرنے پر مجبور کیا جاؤں!! اگر "دڑلیلی" کے ہم جنسوں نے اپنے پیشہ سے استعفیٰ نہیں دیا تو مجھے کیا پروا ہے، اگر سارے یورپ کے وزرائے اعظم

استعفیٰ دے دیں!! اگر وہسکی کے کارخانوں میں کافی وہسکی تیار ہو رہی ہے تو پھر امریکہ میں سونے کی مقدار کے کم ہو جانے سے مجھے کیا غرض! اگر ہندوستان میں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے جس کے جراثیم کا زہر قاطع یاہ ہو تو پھر جاپان کی وبا کے حالات پڑھ پڑھ کر میں کیوں ماتم کرنے لگوں! دُنیا کے سارے وطن پرستوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ، سب کو ہارنا پڑے گا

—— میری دلیل بہت قوی ہے —— لاجواب ہے۔

بڑے بڑے منطقی دوستوں کی زبان بند کر دیتا ہوں ——

وہ آخری حُجّت ہے —— عورت اور مینائے مے!! ——

دیسی ہو یا بدیسی! مجھے تو وطن پرستی۔ قوم پرستی، تہذیب، تمدن، مذہب اور اسی قسم کی تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے ——

عورت اور مینائے مے!! اُس بے وقوف روسی شاعر کا قلم میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں یُوں اُس کی نظم کو ختم کرتا:—

وو گناہ کر، پکا پاپی ہو جا، رات دن کا فرق بھول جا

بھوکے کُتّے کو اپنے دروازے ——

سے لات مار کر بھگا دے اور لمبی لمبی ڈکاریں لے کر

نرم بستر پر سو جا —— صبح کہ اگر روس کی

زمین پر امریکہ کا جھنڈا نصب ہو جائے تو وودکا کے

بجائے پیر مینی شروع کر دے اور اگر انگلستان کا قبضہ ہو جائے تو وہسکی پی، فرانس قابض ہو جائے تو انگوری پی، اور اگر مہاتما گاندھی کا چرخہ چلنے لگے تو سیندھی پی، ٹھرّا پی، اور یاد رکھ ـــــــ اخبار کبھی نہ پڑھ!!"

۱۶ راگست

لاکھوں برس پہلے، جب ہنوز انسان جنگلوں میں ننگا پھرتا تھا ـــــ کیا اچھے تھے وہ دن ـــــ جب وہ درختوں پر اور غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا ایک دن اس صحرائی آبادی میں ایک انسان درخت کی بلند شاخ سے نیچے کیچڑ میں گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی دوسری شاخوں پر جھول رہے تھے۔ اس کو کیچڑ میں سنا ہوا دیکھ کر خوب ہنسے، اِن میں سے ایک ہنستے ہنستے بے قابو ہو کر خود بھی اس طرح کیچڑ میں گرا کہ ہنسنا بھول گیا، چوٹ بھی لگی، کیچڑ میں لت پت ہو گیا، منہ پھلائے ہوئے اُٹھا اور صحرائی چشمہ کی طرف چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چشمہ کے پانی سے اپنا بدن صاف کرے، مگر کنارہ پر پہنچ کر اس چشمہ کے شفاف پانی میں دفعتاً اس کو اپنا عکس

نظر آیا ـــــــ کیچڑ میں لت پت، منہ سنا ہوا - ہاتھ پاؤں لتھڑے ہوئے، ناک پر مٹی کا ایک تودہ چپکا ہوا ـــــــ ہئیت کذائی نہایت تمسخر انگیز ـــــــ وہ پانی پر اپنے اس عکس کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا - باوجود چوٹ کے تکلیف کے اس کو اپنے حال پر ہنسی آ گئی! ـــــــ

اُس وقت پہلی دفعہ انسان نے جُرأتِ مردانہ کی بہترین مثال پیش کی ـــــــ یہ جُرأت کہ اپنی چوٹ اور اپنے دکھ پر ہنس دے!! آج بھی لاکھوں برس بعد وہی انسان مرد ہے جو تکلیف دہ چیزوں کے تمسخر انگیز پہلو بھی دیکھ سکے، اپنی مصیبتوں کے ہجوم میں تبسم آفرین جزئیات کا پتہ پائے، اپنی تکلیف میں مسکرانے کا موقعہ نکال لے!! ـــــــ یہ قصہ مجھے اِس لیے یاد ـــــــ

آیا کہ اختر نے آج صبح معترضانہ کہا تھا کہ تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے اور موقعہ اور بے موقعہ ہی ہی ہا ہا کرتے رہتے ہو، واقعہ یہ ہوا کہ میاں اختر اپنی ایک معشوقہ کے مکان پر تشریف لے گئے اُس کے دروازہ کے قریب ہی سامنے سے اپنے چچا میاں کو آتے دیکھ کر ایسے گھبرائے کہ دروازہ میں گھس گئے، وہاں تھا اندھیرا اور راستہ میں پڑا تھا ایک تخت، ٹھوکر کھا کر گرے تو ناک پر چوٹ آئی، جھنجھلائے ہوئے اندر

پہنچے تو مسماۃ کسی دوسرے چاہنے والے کے ساتھ تخلیہ فرما رہی تھیں ۔ جلے بھُنے میرے پاس آئے ، میں نے شروع کیا مذاق ، بالکل آگ ہو گئے ———— اصل یہ ہے کہ اپنی حماقت کے تکلیف دِہ نتائج پر خود ہی ہنسنا ، ہے بہت مشکل کام اور جو لوگ ایسا کر سکتے ہیں ان کی اخلاقی سطح درحقیقت بہت بلند ہوتی ہے ———— میاں اختر ابھی کچّے ہیں !!

۱۹ اگست

خانہ بدوش ———— آوارہ گرد ———— وہ سب ہیں جو انسان اور آدمی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں ۔ ایک ویرانہ ہے ، یہ دُنیا ۔ زندگی ایک لمبی سڑک ہے جو نہ معلوم کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوتی ہے ۔ ایک انبوہ کثیر ہے جس میں ہم سب ایک دوسرے کو دھکّے دیتے ، کہنیاں مارتے ، کچلتے ، روندتے ، گرتے پڑتے ، دوڑتے یا لنگڑاتے چلے جا رہے ہیں ، خراب و خستہ ———— اس کا نام زندگی ہے !! کسی ستم ظریف خالق نے ہمیں اپنا کھلونا بنایا ہے ———— گدھے بنائے ہیں اور اُن سے کھیل رہا ہے ۔ کسی کا کان اینٹھ دیا ، کسی کی ٹانگ توڑ دی ، کسی کی دُم کھینچ لی ، کسی پر پتھر اور کسی پر

جواہرات لاد دیے، کسی کو اتنا کھلا دیا کہ اُس کا پیٹ پھٹ گیا اور کسی فاقہ زدہ کے منہ کا نوالا بھی چھین لیا!!——
یہ سب گدھے دَوڑے دَوڑے پھر رہے ہیں —— کدھر ہے؟ کہاں ہے؟ کون ہے؟ کوئی مسجد کے مینارہ پر چڑھ کر پکارنے لگا، کسی نے مندر میں گھنٹے بجانے شروع کر دیے، کوئی کتابوں کے ورق اُلٹنے لگا —— بحثیں چھڑ گئیں۔ یہ نہیں وہ ہے، وہ نہیں، یہ ہے! خدا ایسا ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوتا، بیچ میں کوئی صاحب بول اُٹھے:۔ ہوتا ہے بھی ہے؟ ہے بھی؟ پھر سب طرف سے بھونک شروع ہوگئی، پنجوں اور دانتوں سے لڑنے لگے، گلے کی رگیں پھول گئیں، منہ سے کف گرنے لگا —— گوشتِ خر دندانِ سگ!! نتیجہ؟ نتیجہ سب یکساں —— یوں ہی لڑتے لڑتے مر گئے —— اور مرنے کے بعد؟ کسی نے کہا جنّت اور حُوریں، شہد کی نہریں اور دُودھ بھرا حوض! کسی نے کہا شکتی اور مکتی، کسی نے کہا آواگون!—— معلوم کسی بیوقوف کو کچھ نہیں! اللہ اللہ کرنے والے بھی گئے، رام رام کرنے والے بھی مرے، خاک میں دبائے گئے یا آگ میں جلائے گئے —— باقی کوئی نہ بچا! اور اللہ اگر کوئی ہے تو وہیں کا وہیں رہا جہاں تھا، مرتے رہو، مٹتے رہو، روتے رہو،

بسورتے رہو، ـــــــــ مختار نہیں ہو، مجبور ہو، اس ساری زندگی میں جو موت سے زیادہ غمناک اور دوزخ کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہے شعریت اور جنت کا کوئی پہلو ہے تو وہ صرف عورت ہے اور اس کے لیے مرد کی مطلب!" مگر قیامت ہے کہ روشنی کی اس ذرا سی شعاع کو بھی مذہب والے مٹائے ڈالتے ہیں، آنکھیں نیچی رکھو، نا محرم آنکھ سے آنکھ نہ ملاؤ، ہاتھ سے ہاتھ مس نہ کرو، پھر یہ دھمکیاں کہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں گے، آنکھیں پھوڑ دی جائیں گی، دوزخ کے سرخ دہکتے ہوئے انگارے حلق میں ٹھونسے جائیں گے ستر ہزار برس مبتلائے عذاب رکھے جاؤ گے، ستر ہزار کوڑے مارے جائیں گے، ستر ہزار سانپ تمہارے جسم سے لپٹیں گے، ستر ہزار بچھو تمہارے ڈنک ماریں گے ـــــــــ تنگ آگیا ہوں"

اس تمام جبر و قہر سے! میں اس ذلیل محکومیت اور جابرانہ تخویف سے اپنی آزادی کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں، پکار کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کا محکوم نہیں، صرف حسنِ ازل کا غلام ہوں، اور اگر خدا بھی حسنِ ازل ہے تو مجھے اس کی خدائی سے انکار نہیں! مگر یہ نہ ہوگا کہ جبر و قہر اور

تخویف و تعذیر میری فطرت کے تقاضوں کو دبا سکے، حُسن کی غلامی عین آزادی ہے جس طرح ایک قطرہ پیالہ میں مقید اور دریا میں آزاد ہوتا ہے اسی طرح میرا وجود مذہب کے پیالہ میں بند رہنا قبول نہیں کرتا وہ حُسن اور محبّت کے بہتے دریا میں آزاد رہنا چاہتا ہے ——— کس کو سمجھاؤں، کس کو بتاؤں ؟ تمام دُنیا کے لیے وقوف خدا کو حُسن و مہر کے بجائے جبر و قہر کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ اس کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں مگر حُسن کو ازلی اور ابدی نہیں کہتے!! ——— ان کی کھوپڑیاں اُلٹی چپکائی گئی ہیں!!

۲۵ راگست

رات صحنِ چمن میں حبس تھا اور گرمی کی شِدّت نے مجھے اور اُس کو بوکھلا دیا تھا۔ ہوا نام کو نہ تھی، وہ مخمور تھی اور میں مست، اُس نے کہا لبِ بام چلو، وہاں کچھ رمق ہوگی۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی، میں اُس کو گود میں اُٹھا کر زینہ پر لے چلا۔ اس کا جسم میرے بازوؤں پر رکھا ہوا تھا اور اس کی صندلیں بانہیں میری گردن میں لپٹی ہوئی تھیں۔ پہلے زینہ پر میں اُس کو لے کر ایک سانس میں چڑھا۔ جیسے کڑی کمان کا تیر!

وہ میرے آغوش میں آنکھیں بند کیے ہوئے قدم بقدم بلند ہونے کا مزا لوٹ رہی تھی ——— پہلے زینہ کو ختم کر کے میں نے ایک لمحہ توقف کیا کہ ذرا اپنے آغوش کی گرفت کو درست کرلوں۔ پھر میں دوسرے زینہ پر چڑھا، رفتار ذرا سُست تھی مگر کیف باقی تھا۔ ہوا کے دو چار معطر جھونکے بھی فروغ مے سے تمتمائے ہوئے چہرہ پر بہت خوش گوار معلوم ہوئے۔ میں نے یہ زینہ بھی ختم کرلیا، اُس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ میرے گلے کو آہستہ آہستہ پیار کر رہے تھے ——— میں نے پھر اس کو اپنے آغوش میں سنبھالا، ذرا دم لیا تیسری منزل دُور نہ تھی۔ مگر جی چاہتا تھا کہ دوسری ہی منزل پر ٹھیر جائیں! لیکن دل نے ٹوکا:۔ "کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ تو تھک گیا" میں نے پھر ہمت کی اور اس کو گود میں سمیٹ کر تیسری منزل کی طرف چلا مگر اس منزل کا ہر قدم کس قدر گراں اور مشکل ہو گیا تھا۔ پسینہ آگیا، ان چند سیڑھیوں میں ہر سیڑھی ایک کڑی منزل تھی، سانس کا سلسلہ تیز ہو گیا، ہر دو قدم کے بعد دو منٹ دم لینے لگا ——— اُس کو اب بھی کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے ——— میں ہانپ رہا تھا، جی چاہا کہ ایک سیڑھی پر بیٹھ کر ذرا سستا لوں، یا اُس کو گود سے اُتار دوں ——— اندر سے

آواز آئی ـــــ ایسا نہ کیجیو، وہ سمجھے گی تم تھک گئے!
ـــــ مردوں کی تھکن کتنی ہی ہو پر عورت اس کو نہ سمجھے!
مردانہ نخوت نے سہارا دیا، باقی سیڑھیاں کسی نہ کسی طرح
طے کیں، صحنِ بام پر پہنچ کر میں نے کہا "لو اب گود سے اُترو!"
اُس نے اپنی نیم ہوشیار آنکھیں کھولیں ـــــ "بس!
پہنچ گئے!" ـــــ "ایک منزل اور ہوتی تو میں اسی
طرح تمہاری گود میں سوار چڑھتی!" اُس "بس!" کی بلاغت
نے مجھے شرما دیا۔ میں نے کہا، اب اگلی منزل اور تو کوئی نہیں،
آسمان ہے! کہو تو اُدھر کا رُخ کروں؟ دل کہہ رہا تھا، کب
یہ گود سے اُتریں گی!! ـــــ تیسری منزل کے کھلے ہوئے
صحن میں ایک نرم قالین پر میں نے اُس کو اپنی گود سے اس
طرح لوٹ دیا ـــــ بکھیر دیا ـــــ جس طرح دامن سے
پھولوں کو! میں پسینہ میں نہا رہا تھا، ہانپ رہا تھا، کمر میری
کمان ہو رہی تھی مگر وہ میرے آغوش کی گرمی سے مست و
مخمور تھی! اُس کا دل اِس طرح میرے دل کے پاس دھڑک
رہا تھا جس طرح صرف عورت ہی کا دل مرد کے آغوش میں
دھڑک سکتا ہے! کس قدر مختلف تھی، میری اور اُس کی
حالت! وہ سرورِ عیش میں غرق، میں تھکا ہوا!! گویا وہ

کہتی تھی "بس نہیں ——— اور" اور یہیں شرمایا جاتا تھا!!
——— کیا اسی کا نام بڑھاپا ہے!! ———
شباب کے روانہ ہونے والے قافلہ کی پہلی گھنٹی! جب آدمی پھولوں کی ایک گٹھری کو لے کر تین منزل بھی نہ چڑھ سکے تو سمجھ لیجیے کہ "رستم خانی" ختم ہوئی ——— اپنے اِس انحطاط کو ہر مرد عورت سے چھپاتا ہے، مگر کب تک؟ وہ تھک جاتا ہے، اُس کے بوسے بھی تھک جاتے ہیں، اُس کے آغوش کی گرفت بھی تھک جاتی ہے اور کوئی اُس کے کان میں کہتا ہے:-

اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی!!

۵ ستمبر

میاں اختر کے ایک دوست نے کل کسی وجہ سے خودکشی کر لی۔ اختر بہت مغموم آیا۔ کہنے لگا خودکشی دیوانگی ہے یا بے اختیاری یا بزدلی۔ میں نے کہا ان میں سے کوئی بات بھی خودکشی کے فلسفہ کی تشریح نہیں کرتی۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ خودکشی دیوانگی کا ایک مظاہرہ ہے تو بھی یقیناً وہ ایک بڑا کام ہے۔ ہر بڑا کام دیوانگی کی حالت میں انجام پاتا

ہے، کوئی بڑا کام بغیر دیوانگی کے انجام نہیں پاتا۔ اگر دیوانگی ہی کو خودکشی کا سبب مان لیا جائے تو بلاشبہ وہی سبب اِس فعل کے ارادہ کی بلندی کا ثبوت ہے۔ بے اختیاری اور دیوانگی بغیر مچھر اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اب رہی بُزدلی تو خودکشی کے فلسفہ میں تو بزدلی کو کوئی دخل ہی نہیں۔ دوسروں کی جان لینا اکثر بُزدلانہ جذبات پر مبنی ہوسکتا ہے مگر خود اپنی جان لینا یا دینا بہادری، عالی حوصلگی، خود مختاری اور آزادی کا سب سے بڑا مظاہرہ ہے۔ اس فعل کی معنوی حیثیت پر غور کرو تو مذہب و اخلاق کے فیصلے اور فتوے بالکل لغو اور بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔

انسان کی زندگی کا سب سے اعلیٰ تخیل آزادی کا تخیل ہے — عقل، ضمیر اور ایمان کی آزادی، جس پر مذہب قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ خدا اور اُس کی شان جبر و قہر کے تخیل نے آزادی کی معنویت کو فنا کر ڈالا۔ گویا انسان ایک ایسا بندہ ہے — لاچار اور مجبور — اپاہج اور کوڑھی — جس کی ناک میں ایک مضبوط نکیل پڑی ہوئی ہے اور یہ نکیل اس نکیل کی رسی کے ذریعہ سے کھینچا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے، گھسیٹا جاتا ہے، باندھا جاتا ہے — وہ خود اپنی

مرضی سے نہ ایک قدم اُٹھا سکتا ہے، نہ بغیر اجازت آنکھ کھول سکتا ہے نہ ایک لمحہ سوچ سکتا ہے!! پھر جب اِن بیلوں میں سے کوئی ایک ناک کو نکیل سے نکال کر رسی کے پھندے توڑ ڈالتا ہے اور آزاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو مرتد کہلاتا ہے، کافر کہلاتا ہے، مردود و ملعون کے نام سے یاد کیا جاتا ہے! میں نے اختر کو ایک مشہور روسی مُصنّف کے چند فقرے سنائے جو وہ اپنے ہیرو کی زبان سے ادا کراتا ہے، یہ ہیرو خودکشی کرنے کے متعلق اپنے ارادہ پر انسان کی خود مختاری اور آزادی کے فلسفہ کو دلیل لاتا ہے اور کہتا ہے :-

"مجھے تعجّب ہوتا ہے کہ سب لوگ کیونکر بلا تامل جیتے رہتے ہیں —— اس غلامی کی حالت میں —— کیا اِس دُنیا میں ایک بھی ایسا مرد نہیں جو اپنی شخصی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملہ میں خود مختاری جتانے کی ہمّت کر سکے؟ —— —— مَیں اپنی خود مختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں، مَیں اُسے ثابت کر دوں گا چاہے مجھے ایک بھی ہیرو اور شریکِ کار نہ ملے۔ مجھ پر لازم ہے کہ اپنے گولی مار لوں کیونکہ اپنے ہاتھوں سے فنا ہونا خود مختاری کی انتہا

ہے ————"

اختر اپنے دوست کے غم میں اور اس غم سے زیادہ اپنی دیرینہ توہم پرستی میں مبتلا تھا، وہ میرے اس نکتہ کو سمجھتا تو کیا، شاید اُس نے سُنا بھی نہیں۔ کہنے لگا:۔ "اب اِس بحث سے فایدہ کہ مرحوم کا فعل اچھا تھا یا بُرا؟ مجھے تو اپنے دوست کی جدائی کا غم بے حال کیے دیتا ہے" میں نے کہا، آختر! غم کی حقیقت بہت ناقابلِ اعتنا ہے۔ وہ محض ایک اصطلاح ہے ——— بے معنی ——— ایک نہایت عارضی کیفیت ہے جو کمزور دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے، دل و دماغ جس قدر کمزور ہوتا ہے اسی قدر زیادہ یہ کیفیت طاری ہوتی ہے، کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ اگر ہر شخص اپنی عمر کے مغموم کرنے والے واقعات کا حساب لگائے تو ابتدا سے انتہا تک اس کو اپنی زندگی کے سینکڑوں ہزاروں واقعات ایسے یاد آئیں گے جو اس کے انتہائی غم والم کا باعث ہوئے تھے اور جن میں سے ہر غم ایسا تھا کہ وہ اس کو جانگذار سمجھتا تھا۔ لیکن غم گذر گیا اور جان موجود ہے! مثلاً جب ایک باپ کا اکلوتا بیٹا مرا تو اُس نے دیواروں سے اپنا سر ٹکرایا، وہ ہفتوں، مہینوں، برسوں، مبہوت اور بے حال رہا، برسوں اس کے آنسو خشک نہ ہوئے،

وہ قبر پر مجاور بن کر بیٹھا، وہ تمام لذات دُنیا سے دست کش ہوگیا، اُس کو یقین تھا کہ وہ اسی غم میں گھُل گھُل کر مرجائے گا ـــــ مگر ـــــ ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ چند روز بعد وہی انسان ہے، وہی دیواریں ہیں، وہی خشک آنکھیں ہیں، وہی دُنیا کی لذتیں ہیں۔ بیٹے کی قبر پر نہ اب چراغ ہے نہ پھول ہیں، غمگین نہیں، اُس کو رفع غم کے بہت سے ذرایع مل گئے !! اب اس کی زندگی کا وہ حادثہ ایسا ہے جیسے کسی نے بہتے دریا کے ساحل پر کھڑے ہوکر ایک سنگریزہ پانی پر پھینکا، اُس سنگریزہ کے گرنے کی آواز آئی، تھوڑی دیر تک پانی کی سطح پر گول دائرے بنتے رہے، اُس کے بعد پانی کی سطح پھر ہموار ہوگئی ـــــ دریا کا بہاؤ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ رُک سکا ـــــ

ـــــ میں نے اختر سے کہا کہ تم پہلے اپنے ہی باپ کا حال دیکھ لو۔ جب تمھاری ماں اُن کی چہیتی بیوی، مری تھیں تو دو برس تک وہ کس طرح زمین پر لوٹا کرتے تھے اور تم لوگ سمجھتے تھے کہ وہ پاگل ہوکر اسی حال میں مرجائیں گے۔ لیکن ہوا کیا؟ دریا کی وہ موج گذر گئی۔ ہمارے چچا صاحب قبلہ نے ۶۵ سال کی عمر میں دوسرا بیاہ رچایا، اولاد پیدا کی، داڑھی پر خضاب لگانے لگے۔ بچوں کو گود میں لیے شادان و

فرحان، ہنستے مسکراتے، پھرا کرتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بڑے میاں وہی ہیں جو دس برس پہلے دیوانوں کی طرح قبرستان کی قبروں سے سر ٹکراتے پھرتے تھے! اس عارضی اور نقشِ برآب کیفیت کو ——— میں نے کہا ——— آدمی پیدا ہی کیوں ہونے دے۔ وہ تکلیف جو چند روز بعد یقیناً رفع ہو جانے والی ہے چند روز بھی کیوں ہم پر مسلّط رہے، اُس کیفیت کو ہم پیدا ہی کیوں ہونے دیں۔ میری خود تو یہ حالت ہے کہ میرا کوئی عزیز، دوست یا معشوق مرجائے تو میرا توحش اور تردد بمشکل اُس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کے کفن دفن سے فراغت حاصل ہو۔ اس کے بعد، جو چیز گذر گئی اس کو یاد رکھ کر میں اپنے قلب کو چند روز بھی افسردہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ سچ ہے کہ مجھے اس انسانی کمزوری کو رفع کرنے کی ——— جس کو غم کہتے ہیں ——— تھوڑی سی کوشش ضرور کرنی پڑتی ہے۔ مگر یقین جانو میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ یہ کوشش کی اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنی اس کمزوری کو بہت کچھ رفع کر لیا ہے۔ اختر کہنے لگا خدا وہ دن نہ لائے۔ لیکن اگر کوئی وقت ایسا آیا تو تمہاری غم رُبا طاقت کے کرشمے ہم بھی

دیکھیں گے۔ پھر وہ کہنے لگا، تم بھول گئے۔ "لیلیٰ" کے عشق میں تمھارا کیا حال ہوا تھا۔ میں نے کہا تو بیوقوف ہے۔ جس کو تو غم سمجھا وہ غم ہی نہ تھا۔ مستی کا ایک جھونکا تھا، "طلب" کا ایک جذبہ تھا ——— محبت کی شراب بالکل میٹھی ہو تو بے کیف ہو جاتی ہے۔ اُس کے اندر تھوڑی تلخی بھی باقی رہنی چاہیے۔ عیش کے پجاری اپنی آنکھوں سے جو آنسو گراتے ہیں وہ آنسو خود جزو عیش ہوتے ہیں۔ اِن آنسوؤں کو اُن آنسوؤں سے کیا علاقہ جو کفنائے دفنائے مردے کے لیے بہائے جائیں۔ آنسو بہانے ہوں تو کسی جیتے جاگتے دِلربا کے لیے بہاؤ۔ میں اعتراض کروں تو گنا ہگار!

۱۱رستمبر

حسین عورت کی محبت دل، دماغ اور جسم کے تمام قویٰ کو متاثر، ماؤف اور مجبور کر دیتی ہے، مگر معدہ اور آنتیں اپنی آزادی اور خود مختاری اِس حال میں بھی قایم رکھتی ہیں! "عشق" کا کتنا ہی شدید حملہ ہو مگر بھوک ضرور لگتی ہے اور نہ بھی لگے تو بھی کھائے بغیر مفر نہیں۔ تقاضا ہو یا نہ ہو معدہ اور آنتوں کو ان کا خراج ہر حال میں ادا ہی

کرتا ہوتا ہے! عشق کی شہنشاہیت کو آنتیں کسی طرح قبول نہیں کرتیں! جو لوگ اِس حقیقت کو یاد رکھتے ہیں وہ حُسن پرستی کی زندگی کو اپنے لیے قدرے آسان بنا لیتے ہیں۔ میرے ایک دوست تھے، خدا بخشے، ۶½ فٹ کے قریب اُن کا قد، جسم کا یہ حال کہ معمولی کرسی یا پلنگ اُس کا حریف نہ ہوسکے، مزاج شاعرانہ، طبیعت رندانہ، ذات کے ٹھیٹھ پٹھان، متوسط حیثیت کے زمیندار۔ دلّی کی ایک بازاری عورت پہ مفتوں تھے ان کے عشق کا موسم مقرر تھا۔ زمینداری میں تحصیل وصول کا وقت سال میں دو دفعہ آتا ہے۔ ایک دفعہ جولائی میں، ایک دفعہ دسمبر میں۔ یہی خاں صاحب کی عشق کی تجدید کا زمانہ ہوتا تھا۔ گاؤں سے چار پانچ ہزار روپیہ وصول کیا، بجنسہٖ لوہے کے بکسوں میں بھرا اور سیدھے دلّی آگئے۔ "عشق" اپنی پوری شدّت کے ساتھ شروع ہوگیا، بی صاحبہ بھی خاں صاحب سے جوابی التفات کرنے لگیں۔ دو تین مہینے دن اور رات محفلِ عیش جمی، خاں صاحب کا یہ حال کہ ایک لمحہ کے لیے بھی معشوقۂ طنّاز کا آنکھوں سے اوجھل ہوتا گوارا نہیں، اسی حالت میں رفتہ رفتہ لوہے کے بکس خالی ہونے لگے، آخر کار جس دن ملازم نے

دست بستہ عرض کیا کہ سرکار! اب صرف ریل کے کرایہ کے بقدر روپیہ باقی ہے، خاں صاحب کے "عشق" کا سمند بادپا دوڑتے دوڑتے دفعتاً رُکا، سامان بندھنا شروع ہوگیا، دو روز بعد خاں صاحب رخصت ہوگئے، بی صاحبہ اسٹیشن تک اُن کو "خدا حافظ" کہنے آئیں۔ خاں صاحب وطن کو سدھارے ——— تین چار مہینہ بعد پھر جب خریف کی فصل کا روپیہ وصول ہونے لگا۔ تو "عشق" کے جراثیم بھی بیدار ہونے لگے اور پھر دلّی کے کسی ہوٹل میں حُسن و عشق کی وہی آویزش شروع ہوگئی!! تقریباً ۲۰ برس تک خاں صاحب اسی وضعداری کے ساتھ "عشق" کرتے رہے اور ان کی معشوقہ بھی اُن کے ساتھ نباھتی رہیں، حتیٰ کہ اُن ہی کی گود میں ایک دن خاں صاحب نے ایسی آنکھیں بند کیں کہ پھر نہ کھولیں!! مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ معدہ پر عشق کا زور نہیں چلتا۔ جسم کا بادشاہ دماغ سمجھا جاتا ہے یا دل، مگر دونوں حُسن و عشق کے مقابلہ میں اپنی حکومت سے دست بردار ہوجاتے ہیں، لیکن معدہ حضرتِ عشق کا حکم کسی طرح نہیں سُنتا! دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہے تب ہی حُسن کا جوہری ان

موتیوں کو پرکھ سکتا ہے! پیٹ خالی ہو تو چودھویں کا چاند اور آسمان کا تارا اُس کی "طلب" کو تسکین نہیں دے سکتا ——— مٹھی بھر آردِ گندم اس سب پر بالا ہے!!

۱۹ر ستمبر

بے وقوف، گدھے، عقل کے پیچھے لٹھ لیے پھرتے ہیں۔ سائنس، سائنس، سائنس! سُنتے سُنتے تھک گیا ہوں! خدا جانے کس طرح بی۔ اے کے درس میں پروفیسر نے یہ بلا میرے دماغ میں ٹھونسی ہو گی، اُس دن کے بعد سے آج تک پھر تو میں نے کبھی نام نہیں لیا! کہتے ہیں کہ علم کی افزونی انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا باعث اور عقل کی ترقی و وسعت اس کی دنیوی زندگی میں راحت کا موجب ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ دُنیا کو تباہ کیا علم کی افزونی اور عقل کی افزائش نے، ہم کو راحت اور سکونِ قلب سے محروم کیا علوم کی ترقی نے ——— انسانوں کے قلوب ہنجور کر ڈالے، زندگی کا سکون و اطمینان خاک میں ملا دیا ——— سانس لینا مشکل ہو گیا ——— علم کی اس ترقی اور عقل کے اس ارتقا کی بدولت! جو کام پہلے مذہب کرتا تھا وہ اب سائنس انجام

دیتی ہے۔ اوّل تو مذہب نے انسانوں کو انسانوں سے لڑایا، خون کی ندّیاں بہائیں، مخلوق کو بھوکا مارا۔ کسی طرح مذہب کا زور ٹوٹا تو اب سائنس کا عفریت میدان میں بل کھاتا ہوا آیا۔ پہلے اللہ اور رسول کا نام لے کر "تہذیب" اور "اخلاق" کے عَلَم بلند کیے جاتے تھے اور ان عَلَموں کے سایہ میں خون بہایا جاتا تھا اور ہڈیاں چبائی جاتی تھیں، اب سائنس اور عقل کا خونخوار دیوتا ہمارے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ مفر کی صورت کوئی بھی نہیں!! یہ تو سب کہتے ہیں کہ سائنس نے انسان کو بہت فائدہ پہنچایا مگر ثابت کوئی نہیں کر سکتا کہ فائدہ پہنچایا کیا۔ سوال کیجیے تو کہیں گے: واہ، یہ ریل، یہ تار برقی، یہ بجلی، یہ ٹیلیفون، یہ آلات ہوائی ——— یہ اور یہ اور یہ! ان بے وقوفوں سے پوچھیے کہ جب یہ نعمتیں دُنیا میں نہ تھیں تو انسان آج سے بہتر حالت میں زندہ تھا یا نہیں؟ مانا کہ اس کے سفر لمبے اور تکلیف دِہ، اس کے کھانے بے مزہ اور پھیکے، اس کا لباس موٹا اور بھاری تھا، مگر اُس کی عمر آج کے مقابلہ میں کتنی زیادہ، اُس کے قوٰی کس قدر مضبوط، اس کا دل کیسا مطمئن تھا! یہ سچ ہے کہ رکابدار ایسے نہ تھے، درزی اپنے فن میں اُس قدر ہوشیار نہ تھے، دھوبی اس قدر

صاف کپڑے بجلی کی مشینوں سے نہ دھو سکتا تھا مگر دل میلے نہ تھے، ایلے چین اور کمزور بھی نہ تھے! اُس گذرے ہوئے زمانہ میں جس کو آج کل کے نام نہاد اہلِ علم "زمانہ جاہلیت" کے نام سے یاد فرماتے ہیں، زندگی کے متعلق انسان کے عقاید سیدھے سادھے تھے، زندگی کا تار اس قدر اُلجھا ہوا نہ تھا۔ اسی لیے اُس کا معدہ غذا کو اطمینان اور آسودگی کے ساتھ بہ آسانی ہضم کر لیتا تھا۔ آج جبکہ مذہب اور عقاید میں ایک طرف اور دنیوی معاملات میں دوسری طرف، بال کی کھال نکالی جا رہی ہے، جب کلیسا اور مسجدوں کے منبروں سے چیخ چیخ کر لمبے وعظ سُنائے جا رہے ہیں، جب قوموں کے لیڈر اور ڈکٹیٹر قوم پرستی اور وطن پرستی کے گیت گا رہے ہیں۔ انسان ایک وقت کی روٹی سکون کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتا!! "عہد جاہلیت" کے مقابلہ میں آج اس کو کھانے بے انتہا لذیذ ملتے ہیں لیکن وہ کرے کیا، اس کا معدہ اِن لذایذ کا حریف نہیں ہو سکتا! بستر بھی اس قدر نرم ہیں جیسے کہ پہلے کبھی نہ تھے مگر دماغوں میں خشکی ہے، نیند رات بھر نہیں آتی! زندگی کے دریا کے کنارے علم و فضل کے بہت اونچے اونچے مینار بنائے جا رہے

ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ دریا کا پانی کس قدر گدلا ہو گیا ہے۔ آب مصفا کے بجائے کیچڑ اور دلدل زیادہ ہے! زندگی کا فلسفہ ہزاروں لاکھوں کتابوں سے بھری ہوئی الماریوں میں محفوظ ہے لیکن فلسفہ زیادہ اور زندگی کم ہے! کوئی دن آئے گا کہ فلسفہ ہی فلسفہ رہ جائیگا اور زندگی نام کو بھی نہ رہے گی!! آدمی مشین بن کر رہ جائیں گے۔ ریاضی کے اعداد کی ضرب اور جمع کا حساب لگا لگا کر سانس لیا کریں گے، آنکھوں، کانوں اور ناکوں میں سائنس کے معمل کی نلکیاں گھسی ہوئی ہوں گی، عقل پر فلسفہ کا غلاف چڑھا ہوگا! یہ حالت آج بھی کچھ کم نہیں۔ مدرسوں اور علمی اداروں میں کہیں:-

"دعویٰ مفروض کامل"

"مقدم دائمہ"

"اصطفات"

"اولیات عامّہ"

"علّتِ مستقیم"

"منافی کامل"

"تعمیمات تجربی"

"مغالطات منافات"
"علّتِ قریبہ" اور "علّتِ غیر مستقیم"
"قضیۂ سالبہ و موجبہ"
کی بحث جاری ہے اور طلباء گتھے ہوئے ہیں! کہیں
"تفاعیل زایدی"
"سلسلہ اہتزازی"
"علم مثلث"
"قانون تقسیمی"
"ترکیب و تحلیل"
کے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں۔ پھر اگر ایک طرف
"مابعد الطبیعیات"
"روحانیات"
"سرمدیت"
"ہیولیت" اور
"فوق العقلیّت"
کی اُلجھنوں میں طالبانِ علم کی عمریں ضایع ہو رہی ہیں تو
دوسری طرف
"مذہب تشبہہ"

"تلازم اختراعی"
"محور استوانی"
"اختلاف استلزامی"
"نفس اجتماعی"
"جذبات لاقوتی"
"حقیقت خارجہ"
"ردعمل"
"شعور ذات" اور
"شعور اجتماعی"

کے قلعے بنائے جا رہے ہیں اور گرائے جا رہے ہیں۔ "لطافت و کثافت نوعی" کے گنبد میں طبیعیات کے ماہرین "خارجی" اور "داخلی" عمل کی رسہ کشی کر رہے ہیں اور اپنے افکار عالیہ کے نقوش بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں، بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں!! کہیں دماغوں کے "خلا" میں "رطوبت زجاجیہ" اور "تعاول غیر قایم" کے نظریے کو دائے اور دوڑائے جا رہے ہیں۔ نظریے ہیں کہ آپس میں ٹکرا رہے ہیں، بنتے دیر نہیں ہوتی کہ بگڑ جاتے ہیں! علوم کی فہرست دیکھیے تو وہ ایک شیطان کی آنت ہے، علم سیاست، علم نباتات،

علم الافلاک، آثار قدیمہ، اقتصادیات، معاشیات، علم النفس، منطق، فلسفہ، ہندسی مخروطات، مجسمات، علم مثلث، طبعیات، مابعد الطبیعیات، ریاضی، طبقات الارض اور خدا جانے کیا کیا! کدو کاوش کی کوئی انتہا نہیں۔ اس تمام کدوکاوش کا آخری نقطہ؟ نتیجہ؟ ماحصل؟ یہ ہے کہ:-

دانکس کہ نہ داند و بداند کہ بداند
در جہل مرکب ابد الدہر بماند

اس جہل مرکب کا نام ہے، تہذیب، تمدّن اور علم و فضل!! اصطلاحیں ہیں اور الفاظ کی ترکیبیں اور دماغی الجھٹے! سلجھائے جاؤ الجھائے جاؤ!!

ایک دن کسی رسالہ میں ایک مزیدار لطیفہ پڑھا تھا، کسی پروفیسر صاحب نے اپنی ساری عمر حساب لگانے میں صرف کی تب وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دُنیا کی عمر اب ۲۰ لاکھ سال اور باقی ہے، اُنھوں نے زمین کے طبقات کا مطالعہ کیا، موسموں کے تغیرات پر غور کیا، زمین کی رفتار کا حساب لگایا، اجسام فلکی کے حالات پر نظر ڈالی، سمندر اور خشکی کے گھٹتے بڑھتے رقبہ کو محسوب کیا، ساری عمر اسی مصیبت میں مبتلا رہے تب کہیں اس نتیجہ پر پہنچے کہ دُنیا ۲۰ لاکھ سال بعد

ضرور ختم ہو جائے گی، ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے
جب ان کا مضمون پڑھا تو وہ ایک صفر کم پڑھ گئے اور
سمجھے کہ اوّل الذکر پروفیسر صاحب کی رائے میں دُنیا کی عمر
صرف دو لاکھ برس باقی ہے، انھوں نے اسی بنیاد پر ایک
جوابی مضمون لکھا اور ثابت کیا دُنیا کی عمر ۲ لاکھ سال سے
بہت زیادہ باقی ہے، پھر تو دونوں طرف سے رسائل میں
بحث و مباحثہ کا ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ گویا کہ ۲۰ لاکھ اور
۲ لاکھ کے فرق پر ان دونوں پروفیسر صاحبان کی زندگی کا
انحصار تھا!! ان بے وقوفوں کی نظر اس پیش پا افتادہ حقیقت
سے دُور ہی رہی کہ دُنیا کا خاتمہ تو اسی دن ہے جس دن ان
کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہوگا، سوال تو صرف دس یا پنچ
سال کا تھا ——— اِدھر یا اُدھر ——— اور بحث ہونے لگی بیس لاکھ
اور ۲ لاکھ کے فرق پر!! ———————

اسی طرح ایک زمانہ سے اجرام فلکی اور دُنیا کے درمیان
طول مسافت ناپا جارہا ہے، سفر کی تیاریاں ہورہی ہیں،
مریخ سے پیام و سلام کے ذرائع پیدا کیے جارہے ہیں گویا کہ
اس دنیا اور مریخ کے درمیان ڈاکخانہ اور تار گھر قائم کرکے
ہماری دنیا پر کوئی بڑا ہی احسان کیا جائے گا۔ گھر کے صحن سے

دروازہ تک اور دروازہ سے سڑک تک کے سفر پر تو اختیار حاصل نہیں اور انتظام ہو رہے ہیں ۵ کروڑ میل کا سفر ۵ دن میں طے کرنے کے!

تو کار زمین را نکو ساختی
کہ با آسمان نیز پرداختی

—— کوئی پوچھے کہ احمقو اگر تم نے یہ معلوم بھی کر لیا کہ اِس دُنیا اور مریخ کے درمیان صحیح فاصلہ کیا ہے تو ساری عمر اسی حساب میں کھپا دینے کے بعد تمہاری احمقانہ محنتوں کا نتیجہ کس کے کام آئے گا۔ اصل یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی مصطلحات، محاورات، قیاسات اور تصورات کے اُلجھیڑے میں اس طرح پھنسی ہوئی ہے جس طرح جال میں ایک چڑیا۔ واہمہ کی عمارتیں بہت بلند اور بہت عالی شان بنائی جاتی ہیں، مگر ان سب کی بنیاد اُسی ایک حقیقت مسلمہ پر ہوتی ہے جس کا نام "قانون فنا" ہے! ماہرین علوم بنیاد کو تو دیکھتے نہیں منہ اُٹھائے اُونچی محرابوں اور بلند میناروں اور عالی شان گنبدوں کو دیکھنے میں محو ہیں —— آسمان کی طرف منہ اُٹھائے ہوئے ہیں، زمین کی طرف ان کی گردن جھکتی ہی نہیں!! ہر شخص اپنے واہمہ پر ایک لیبل لگا دیتا

ہے، جُبّہ و عمامہ کے لیبل الگ ہیں، سائنس اور علوم کے لیبل
الگ ہیں، اُن کے خدا کو یہ نہیں مانتے اور اِن کے خدا کو وہ نہیں
مانتے! دُنیا اور عاقبت کے فیصلے دونوں کر رہے ہیں ——
اپنے اپنے حلقۂ حُمق میں! کچھ اصطلاحی صفات مقرر کر لی گئی ہیں،
اچھے بُرے کا ایک معیار مقرر کر دیا گیا ہے —— یہ اچھا یہ بُرا!
یہ گناہ یہ ثواب، یہ صحیح یہ غلط، یہ پاک یہ ناپاک، ——
کیوں؟ وجہ؟ ثبوت؟ —— جواب کا تو ذکر ہی کیا،
سوال کرنا بھی گناہ ہے!! مولانا کا عصا، ماہر علوم کا قلم،
دونوں میں گتھم گتھا ہے۔ بیچ میں پس رہا ہے وہ غریب جو
اس دُنیا میں امن۔ آسودگی اور سکون قلب کے ساتھ اپنی
مختصر زندگی گذارنا چاہتا ہے اور نہیں گذرا سکتا۔ اس کو
احکام دیئے جاتے ہیں —— دلائل سے بے نیاز! اس پر
فیصلے عاید کیے جاتے ہیں —— اُس کے فہم و ادراک سے
سے بعید!! ہدایات نافذ کی جاتی ہیں —— بےچون و
چرا سے بالا! ——
زندگی کے اس گہرے کہر میں مجبور و معذور انسان ٹھوکریں
کھاتے، گرتے، گھسٹتے چلے جا رہے ہیں۔ کچھ نہیں جانتے ——
سوائے اس کے کہ "اختیار" کچھ نہیں اور "جبر" بے پناہ ہے!

—— اختر کہنے لگا،

تمہارا روزنامچہ چھاپا جائے تو کیا ہے؟ میں نے کہا ہوگا کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مذہب اور عقل کے ٹھیکہ دار مجھ سے خفا ہو جائیں گے، ہو جائیں! اگر مذہب والے مجھے جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیں اور عقل والے مجھے پاگل خانہ میں داخل کرا دیں تو میرا کیا نقصان ہے۔ میں نہ مذہب کی دی ہوئی جنت کی تمنا رکھتا ہوں، نہ عقل کی محفلوں میں بار پانے کی خواہش، پھر جو دنیا اور دین کے یہ "ڈکٹیٹر" مجھ سے خفا ہو جائیں تو مجھے کیا پروا —— ہو جائیں خفا!!

۲۸ ستمبر

روزنامچہ کے گذشتہ اندراج کو اختر نے بہت ناک بھوں سکیڑ کر پڑھا۔ کہنے لگا یہ سب پاگلوں کی سی بکواس ہے زندگی کے سارے راستے بند کرتے ہو اور خود کوئی راستہ پیدا نہیں کرتے۔ چاہتے کیا ہو؟ میں نے کہا:۔ صاحبزادے! زندگی کے راستے کہیں پیدا کرنے سے پیدا ہوا کرتے ہیں! ہوا بچھا دیا ہو تو تم اس کو پورا دائیں نہیں بنا سکتے، موسم برسات کا نہ ہو تو تم بادل کہاں سے لاؤگے؟

یہ سب کارخانہ مقررہ ہے، مقررہ نہ بھی ہو تو ہمارے تمھارے اختیار سے باہر ہے ــــــ ساری زندگی اختیار سے باہر ہے، تم جو ہوا کے لیے رفتار اور بادلوں کے لیے بارش کے قواعد و ضوابط نافذ کرنا چاہو تو یہ کس کے بس کی بات ہے! زندگی چلتی ہے جس طرح چلتی رہی ہے، قافلہ کا رُخ تم بدل نہیں سکتے، منزلیں مقررہ ہیں، راستہ کہیں ہموار کہیں ناہموار، جیسا ہے ویسا ہے، تم جو کہو لاؤ سیمنٹ کی ایک اعلیٰ سڑک تیار کر کے اُس پر سفر کریں تو یہ کرہ بھر کی زبان ہل کر رہ جائے گی، ہونا کچھ بھی نہیں! اسی لیے کہتا ہوں ان جھگڑوں میں نہ پڑو۔ جس طرح گذر رہی ہے گذارے جاؤ، دھوپ ہو تو تم سایہ پیدا نہیں کر سکتے، رات ہو جائے تو تم سورج کو نکال نہیں سکتے، نہ اندھیرے میں اُجالا کر سکتے ہو نہ اُجالے میں اندھیرا، دونوں حالتوں میں ــــــ ہر حالت میں گذرے چلے جاؤ! لڑکپن، جوانی، بڑھاپا، جس منزل پر گذرو اُسی منزل کے دستور کی پابندی کرو، ــــــ اور کچھ بھی کرنا نہیں ــــــ نہ سوچنا، نہ دیکھنا، نہ شکایت، نہ شکوہ، نہ آرزو نہ کوشش! ــــــ

اختر ہنس کر کہنے لگا، آج کل بازارِ حسن کچھ "مندا" ہے۔ تم عشق بازی میں مبتلا رہتے ہو تو کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ اس قسم کے بکواس نہیں کرتے۔ میں نے کہا، بازارِ حسن میں بھی خرید و فروخت اختیاری نہیں، جبری ہے! جب وقت آتا ہے جب ہی عشق کا دورہ بھی شروع ہوتا ہے، یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کوئی مجھ سے فرمایش کرے کہ عاشق ہو جاؤ اور میں "بہ تعمیل ارشاد" یا "بپاس خاطر آں عزیز" فوراً عاشق ہو جاؤں!! ــــــــــ

یکم اکتوبر

باپ، بیٹا اور روح القدس مسیحیت کی تثلیث ان ہی تین پر مشتمل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب کے بھی مقررہ ارکان ہیں۔ میرے مذہب کے ارکان بھی تین ہیں، جرمنی میں ہٹلر کا قومی نشان "سواسٹیکا" ہے۔ میرا نشان ایک مثلث ہے، جس کی تثلیث اس طرح قایم ہے:۔

حُسن

موسیقی شراب
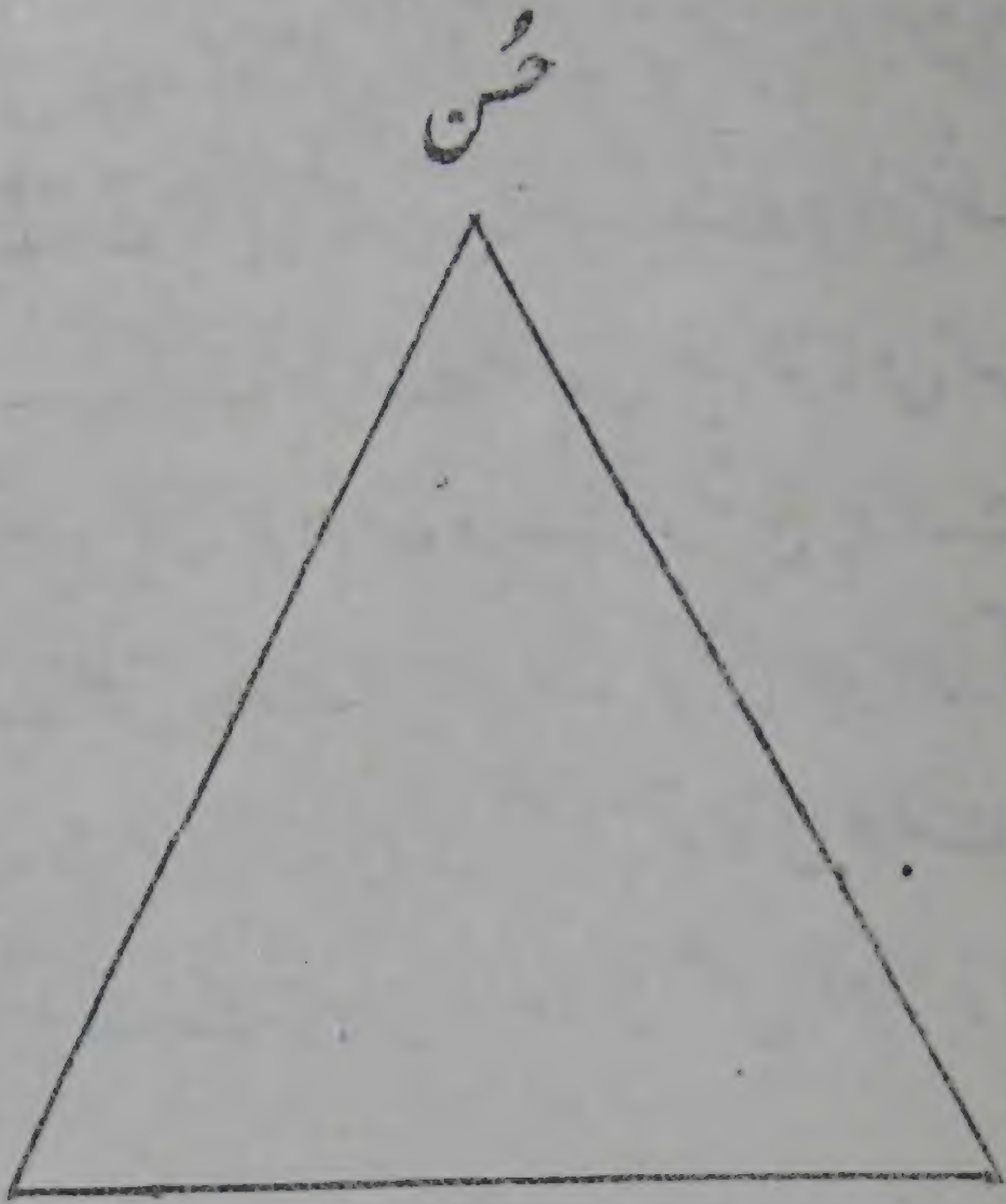
اس مثلث کے تین اضلاع کے اندر میری تمام دُنیا بند ہے۔ ان ہی "اضلاع" پر گھومتا رہتا ہوں اور اسی چکّر میں مست ہوں۔ جس شخص کو اس تثلیث میں سے ایک بھی میسّر آئے وہ کس قدر خوش نصیب ہے، میری قسمت کی قسم کھاؤ کہ مجھے تینوں حاصل ہیں، کس قدر مشکل ہے، اِن تینوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا!! حُسن، موسیقی اور شراب!! ان میں سے ایک بھی ہاتھ آئے تو باقی دو حاصل ہو جاتے ہیں۔ حُسن آتا ہے تو شراب کی مستی اور موسیقی کے کیف تمام کو بھی ساتھ لاتا ہے! شراب آتی ہے تو اکثر حُسن اور موسیقی کو

بھی ساتھ لاتی ہے، موسیقی آتی ہے تو حُسن اور شراب اس کے دامن سے لپٹے آتے ہیں! کون بدنصیب ہے جو اس مثلث سے باہر جانا چاہے ــــــ سوائے مولوی خیرالزمان صاحب قبلہ کے!! وہ شخص ایک جوہر خام ہے جو حُسن پرست ہو اور موسیقی سے بے تعلق رہے، یا جو مے نوش ہو اور کم بخت حُسن پرست نہ ہو! زندگی کی تکمیل تو اسی وقت ہوتی ہے۔ جب اس مثلث کے تینوں اضلاع مکمل اور زاویے مرتب ہوں! ــــــ

۱۰ اکتوبر

خواب میں تصویریں دیکھتا ہوں، جیسے سینما کے پردے پر! گذرے ہوئے افسانے تازہ ہو جاتے ہیں، مُردے قبروں سے نکل نکل کر میری آنکھوں میں گھس جاتے ہیں، بھولی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں، ایک ایک تصویر پردہ پر نمودار ہوتی ہے، میں اس کو پہچانتا ہوں ــــــ میت گذر جاتی ہے ــــــ یہ کون ہے؟ کملا دیوی! کیا قیامت تھی کم بخت! ــــــ یہ کون؟ نور جہان! کس قدر شوخ تھی اس کی جوانی! ــــــ یہ موہنی! وہ خاص باغ کی

راتیں، مرمریں حوض کے کنارے، چاندنی کا عکس پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر، فوارے کی بُوندیاں، میں اور میرے آغوش میں ہومینی!
——— خدا جانے کہاں ہے ——— یہ انجمن آرا!
میرے محفل شباب کی نورانی شمع ——— کس قدر جلد خاموش ہو گئی ——— تیتری کی طرح رنگین مگر جان ہار! صبح کے ستارے کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو گئی!! یہ کون ہیں؟ نام یاد نہیں آتا، صورت یاد ہے، مجھ سے رُوٹھ کر چلی گئی تھی، پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی ——— یہ وہ ہیں جنھوں نے دو برس مجھے دُنیا سے بے خبر رکھا ——— نظر میں نشہ، باتوں میں مستی، اداؤں میں کیف! دو برس اس طرح آغوش میں رہی کہ وہ مزا اب تک یاد ہے! ———

——— ایسی کتنی تصویریں میرے وجودِ معنوی کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، مگر ان سب میں۔ ماضی کے اس تمام منظرِ عام میں، اس تمام انتشار میں، ایک دھندلی سی تصویر اور بھی ظاہر ہوتی ہے، ظاہر ہوتی ہے، پھر غائب ہو جاتی ہے، پھر ظاہر ہوتی ہے، ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں کہ پھر غائب ہو جاتی ہے ——— آنکھوں کا پردہ، اُٹھتا ہے اور گرتا ہے، بار بار، جلدی جلدی! آنکھوں کو

دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی، مگر دل بے چین ہو ہو کر کہتا ہے، ہو نہ ہو یہ تو "اُس کی" تصویر ہے!——————

میں بھولا کیوں نہیں اب تک؟ میں بھول کیوں نہیں سکتا؟ وہی ہے اگر یہ تو پھر؟ کیا وہ کانٹا ابھی تک دل میں اٹکا ہوا ہے؟ یاد آتی ہے؟ گذری ہوئی محبتوں کے مجمعے میں سب سے الگ نظر آتی ہے! وہ سب بھلائے جا چکے جن کی تصویریں کبھی کبھی نظروں کے سامنے آتی ہیں مگر —— یہی ایک ہے جس کو بھولا نہیں، بھلا نہیں سکا! ——————

لیلیٰ! لیلیٰ!! لیلیٰ!!!

۱۴ اکتوبر

کوئی کہتا ہے تجھے دستاویز پر دستخط کرنے ہونگے، اقرار نامہ لکھنا ہوگا —— تو بھاگ نہیں سکتا، تو بچ نہیں سکتا۔ تو سستے سودے کرنے کا عادی تھا مگر یہ سستا سودا نہیں ہے، یہ معاملہ ہی کچھ اور ہے:——————

—— میں گھبرا کر کہتا ہوں مجھے گرفتار نہ کرو، میں دستاویز پر دستخط نہیں کر سکتا میں نے کبھی ایسا نہیں کیا، میں کبھی ایسا نہ کروں گا۔ میں "بازاری" آدمی ہوں" وہ

"بازاری" عورت ہے۔ ہم دونوں ہم جنس ہیں، یکساں ہیں، کوئی کسی کا پابند نہیں، کوئی کسی کا احسان مند نہیں، کوئی کسی کا مقروض نہیں، بازار کا سودا ہے، پھر کیوں کہتے ہو کہ "دل و دین نقد لا"! "دل و دین" سے کیا بحث؟ ——————

کوئی نہیں سنتا اور ایک بھاری چادر ہے —— بے خبری، مجبوری اور بے اختیاری کی۔ جس میں میں لپیٹا جا رہا ہوں!! ——— کہاں ہے؟ ہنوز بازار میں ہے یا کسی گوشۂ عزلت میں یا قبر کی تاریکی میں؟ کہاں ہے؟ معلوم کرنا چاہتا نہیں مگر خبر کا منتظر ہوں! کچھ سننا نہیں چاہتا مگر گوش برآواز ہوں! ——— کیا ہونا ہے؟ اگر وہ ہونا ہے جو نہ ہونا چاہیے تو پھر ہو کر رہے گا جو کچھ ہونا ہے، یوں ہی سہی، اگر نہ بچ سکنا ہی مقدر ہے تو یوں ہی سہی!! "جبر" ہے "اختیار" نہیں ——————

۱۴ / اکتوبر

——— لیلیٰ! ——— لیلیٰ!!

——— ——— لیلیٰ!!!

۱۹ر اکتوبر

لیلیٰ! ——— لیلیٰ!! ———

لیلیٰ!!!

〰〰〰

۲۰ر اکتوبر

صبح ——— لیلیٰ!
شام ——— لیلیٰ!
شب ——— لیلیٰ!

〰〰〰

۲۱ر اکتوبر

روزنامچہ کے بہت سے اوراق خالی ہیں، میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے ——— میر صاحب خبر لائے ہیں کہ وہ بنارس میں ہے، حُسن کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہے ——— بنارس! میرے شانوں پر پَر پیدا ہو رہے ہیں ——— خط لکھوں؟

——— کسی کو ——— بلاؤں؟ ———
بھیجوں؟ ——— خود ہی جاؤں؟ ———
آخر کرنا کیا؟ ———

۱۱ر دسمبر

تقریباً ½ ۱ ماہ کے بعد آج یہ روز نامچہ کھولا گیا۔
یہ ½ ۱ مہینہ بنارس میں گذرا، اس طرح کہ خبر نہیں، کب آیا کیونکر آیا، یہ زمانہ کیسے گذرا؟ اختر اور میر صاحب میرے پاس موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ میں سخت بیمار تھا، لب گور تھا، اطبا جواب دے چکے تھے، احباب مایوس ہو چکے تھے ——— میں کہتا ہوں یہ سب غلط ہے ———
جب میرے سرہانے لیلیٰ نے ۴۵ دن اور ۴۵ راتیں گذاری ہوں، اس کے ہاتھوں نے میرے خشک لبوں کو پانی سے تر کیا ہو، اس کی انگلیاں میری نبض پر کھیلی ہوں، اس کی آواز کی موسیقی نے میرے دل و دماغ کو سکون بخشا ہو ——— تو کس کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ میں بیمار تھا!! حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی عمر میں کبھی اتنا تندرست نہ تھا جس قدر کہ گذشتہ ڈیڑھ ماہ میں رہا جب میرے جسم کی حرارت ۱۰۵ اور ۱۰۶ درجہ

تھی!! زندگی کا شعلہ میرے جسم میں کبھی پہلے اس قدر روشن نہ تھا، میری روح کبھی اس قدر قوی نہ تھی ——— یہ آنکھوں کے اندھے مجھے بیمار کہتے ہیں!! بیماری تو اب شروع ہوتی ہے جبکہ میرا سرہانا خالی ہے اور تیماردار چلا گیا!! ——— وہ کہتی ہے تم اس شہر میں اجنبی تھے، مجھ سے ملنے آئے تھے، میرے مہمان تھے، میں نے حق مہمانداری ادا کیا، اب تم اپنے وطن کو جاؤ، میں اپنے کاروبار میں مشغول ہوتی ہوں!! میں نے کہا شہد کے بعد یہ زہر کیوں؟ کہتی ہے، تم معذور تھے اس لیے میری توجہ کے مستحق تھے، اب تم معذور نہیں ہو ——— اپنے گھر جاؤ اور اگر میری دکان پہ آنا چاہتے ہو تو ——— ایسے آؤ جیسے سب گاہک آتے ہیں ———

میر صاحب اور اختر کے طعنوں نے کلیجہ پکا دیا ہے۔ زہر میں بجھے ہوئے تیر، مجھ پر دن رات چلائے جا رہے ہیں! بس! بس! ترکی تمام شد! مرد میدان نے ہتھیار ڈال دیے، کمر کھول دی! سرفرازوں کے سر اس طرح بھی خاک پر رکھے جاتے ہیں؟ شہسوار یوں بھی گھوڑوں کے قدموں میں روندے جاتے ہیں؟ یہ بھی ہوتا ہے؟ یوں بھی ہوتا ہے؟ آسمان کا ٹھوکا ——— آسما ——— فتنۂ دہر کے دعوے فنا ہوئے ——— (؟)

عبرتناک شکست میں! بس!" میں کچھ
نہیں کہتا، بستر پر پڑا ہوا چھت کی کڑیاں گِنا کرتا ہوں!

۹ر نومبر

جب حُسن و عشق کی اُلجھنوں سے گھبراتا ہوں اور
زندگی کی کش مکش سے دل اُکتا جاتا ہے، مذہب کے نام سے
چڑ پاتا ہوں اور اخلاق و قانون کی پابندیوں سے دل میں
تکدر پیدا ہوتا ہے تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ دُنیا میں
انسان کا سب سے زیادہ فطری مذہب، "مذہب تشکیک"
ہے، اِس مذہب کی تعلیمات کو دُنیا میں کیوں نہ پھیلایا جائے،
مختلف ناموں سے پہلے بھی اس قسم کے عقاید کی تبلیغ کی جا چکی
ہے، لیکن "مذہب تشکیک" کی کامیابی کے لیے گذرے
ہوئے زمانے کچھ زیادہ موزوں نہ تھے، لیکن اب عقل و مذہب
کی آویزش نے اس مذہب کے لیے نہایت موزوں فضا پیدا
کر دی ہے، کوئی وجہ نہیں کہ میں خود اس مذہب کا داعی
اور پیغمبر بن کر میدان میں نہ آجاؤں اور اپنی تمام موجودہ
اور آیندہ نسلوں کو اس مذہب کی طرف دعوت دوں۔ اب تک
جتنے مذاہب دُنیا میں آئے ان سب میں شیطان کی قوت

رحمانی قوتے پر غالب رہی، کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے "شیطانیت" کو نابود یا مضمحل کردیا ہو بلکہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ مذہبی اقوام کی زندگی میں "اہرمن" کی رعایا تعداد میں "یزدان" کے غلاموں سے زیادہ رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ خود مذاہب نے "اہرمن" اور "شیطان" کو بہت قوی پیدا کیا ہے اور قیامت تک کے لیے ان کی قوت کو انسان پر حاوی و مسلّط کردیا ہے۔ اس کے بعد اپنے بندوں کو ہدایت کی ہے کہ اس قوت سے لڑو، مقابلہ کرو، مارو، گراؤ کہ یہی راہ نیکوں کی ہے!! "مذہب تشکیک" مذہب کی اس قدیم فریق بندی سے بالکل آزاد رہے گا۔ وہ "اہرمن" اور "یزدان" کی تفریق ہی کو سرے سے مٹادے گا اور انسان کی دنیوی زندگی کے پیش پا افتادہ حقائق پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھے گا۔ نظم اور ضبط سے اس کے پیرو آزاد رہیں گے اس لیے کہ نظم و ضبط ہی سب سے زیادہ بدنظمی اور افراط و تفریط کا باعث ہے "مذہب تشکیک" میں زندگی کی تعریف یہ ہوگی کہ :-

"زندگی یکسر انتشار ہے، ناقابلِ علاج، کسی چیز کو جزو عقاید نہ بناؤ۔ کسی چیز کا

یقین نہ کرو، اشیاء اور اشخاص کی بُری اور اچھی صفات محض اصطلاحی الفاظ ہیں، ناقابلِ اعتبار! جو کچھ تمہارے سامنے آئے اُس کو شک کی نظر سے دیکھو اور زندگی کا نہ کوئی اصول بناؤ نہ کوئی کلّیہ قایم کرو، کسی اصول اور کلیہ کو تسلیم نہ کرو "مذہب تشکیک" میں تسلیم و اقرار ارتداد سے بدتر اور عین کفر ہے۔ آزاد اور لاعلم اور بے خبر رہو جیسے تم پیدا ہوئے تھے! جستجو اور تلاش ایک جرم ہے، بصیرت گناہ ہے۔ تمہارے اندر سے فطرت جو اشارہ کرے اُس کی تعمیل کرو، عقل اور فہم کی بیہودگیوں سے اپنا دامن پاک رکھو وغیرہ وغیرہ ——"

لوگ پیغمبری کے دعوے کرتے ہیں مگر مذہب کے قدیم تخیل سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ایک ہی ہیولہ کو مختلف صورتوں میں دُنیا کے سامنے لاتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں "اہرمن" اور "یزدان" کا ایک تخیل لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں! یہ سب غلط ہے۔ میں پیغمبری کے دعوے کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہتا، عدم تکمیل اور انتشار کی ایک انتہائی صورت دُنیا کے سامنے

لانے والا ہوں، تیاریاں کر رہا ہوں تاکہ میرے پیغمبرانہ پیغام میں ضبط و نظم کی کوئی خامی باقی نہ رہ جائے۔ صرف چند زندہ اصول دُنیا کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں جو میری "امت" کی زندگی کے فرضی توازن کو مبدّل بہ انتشارِ کامل کر دیں گے۔ وہ انتشارِ کامل جو زندگی کے تمام حقائق میں سب سے زیادہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے

رات مولانا سے میں نے کہا کہ میں چند روز بعد اپنی پیغمبری کا اعلان کرنے والا ہوں، اُن بیچارے کا چہرہ شرقاً غرباً لمبا ہو گیا، کھیا داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے، میاں! توبہ توبہ کرو! آج پیغمبری کا ارادہ ہے تو کل خدائی کا دعوےٰ کر دو گے! میں نے کہا مولانا "مذہب تشکیک" کا پہلا مبلغ تم ہی کو بناؤں گا۔ جو لوگ زیادہ اللہ والے بنتے ہیں اُن ہی میں ارتداد اور کفر کی اہلیت بھی زیادہ ہوتی ہے، اُن کا کفرِ خفی جلی سے زیادہ شدید ہوتا ہے

مولانا بیچارے تمہید کے دو چار ہی کلمے سُن کر عشاء کی نماز کے لیے اُٹھ گئے!!

۱۳ر دسمبر

کل پھر نکاح کا پیغام بھیج دیا، جواب بھی پالیا۔ اُس نے کہا تقدیر میں یہی ہے تو مجھے "ہاں" کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہی ہونا ہے جو ہو گا۔ لیکن اگر میرے تمھارے معاملہ میں تدبیر اور رضا و رغبت کو بھی کچھ دخل ہے تو مر جاؤں گی لیکن "ہاں" نہ کہوں گی —— نہیں! نہیں!! نہیں!!! ——

پھر اُس نے میر صاحب سے کہا:۔ تم کہہ دینا کہ اِن تعلقات کی شعریت میں نکاح کی خشک اور بے نمک سنجیدگی کو شامل کر کے کیوں مجھے بے مزہ کرتے ہو! تیتریوں کی رنگینی اور بلبلوں کے نغموں کو قفس میں بند کر دو گے تو اُن کا رنگ اُڑ جائیگا، نغمے فنا ہو جائیں گے! تم جو اپنی حُسن پرستی پر مذہب کی جانب سے جواز کی مُہر لگانا چاہتے ہو تو مجھے اپنی طرح بے وقوف کیوں سمجھتے ہو کہ میں بھی اپنی شعریت کو مذہب کے تخیل پر قربان کر ڈالوں؟ محبت مجھ سے ہے تو کرو، مگر قبضۂ مالکانہ کی فکر میں کیوں؟ جب مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تمھاری "طلب" مجھے اسیر نہ کر لے میں بھاگی تھی۔ مگر اب جو تم وہی پیام بایں

لے کر یہاں آئے ہو تو میں تمہاری "طلب" سے ذرا بھی
نہیں ڈرتی! جواب مانگتے ہو؟ جواب یہ ہے کہ :- اپنے گھر
جاؤ، کسی شریف خاندان کی ایک معصوم بچّی کا ہاتھ پکڑ کر قاضی صاحب
سے دو بول پڑھوا لو - وہ تمہاری قانونی داشتہ اور مملوکہ
ہو جائے گی اور تم اُس کے آقا اور مالک ______ بلاشرکتِ
غیرے! وہ غریب جو پندرہ بیس برس تک گھر کی چار دیواری
کے اندر ماں باپ کی غلامی کر چکی ہے تمہاری قید میں بھی
قدرے آسودہ رہے گی اس لیے کہ اُس نے آزادی کا مزہ
کبھی چکھا ہی نہیں! وہ زندگی کے صرف ایک ہی رُخ سے
واقف ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے - اس کو کیا معلوم
______ معصوم بچّی ______ کہ غلامی کی اس دُنیا کے پرے ایک
اور دُنیا بھی بستی ہے، جہاں عورت موذی مرد کے دھوکہ میں
نہیں آتی، جہاں عورت اس طرح نہیں پہچانی جاتی کہ یہ فلاں
کی بیوی، یا بیٹی یا بہن یا ماں ہے بلکہ وہ اپنی شخصیت علیحدہ
رکھتی ہے ______ مرد کے پھندوں سے آزاد اور سربلند!!
پھر اس نے میر صاحب سے کہا :- میری طرف سے کہہ دینا
مجھ سے محبت کرو جس قدر کرنا چاہو، مگر میرے حال پر مہربانی
کر کے اپنی جیب سے ہتکڑیاں اور زنجیریں نکال کر مجھ سے

یہ فرمائش نہ کیا کرو کہ میں یہ زیور پہن لوں! جب تم ان زنجیروں کو نکالتے ہو تو تمہارے آغوش میں مجھے جہنم کی آگ بھڑکتی نظر آتی ہے ——— میں بھاگتی ہوں ——— اور تم وہ زنجیریں ہاتھ میں لیے ہوئے میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو! ——— یوں میرا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ دنیا بہت وسیع ہے، میرے پنکھ بہت طاقتور ہیں۔ آج تک کسی مرد کی مجال نہیں ہوئی کہ اُن پر ہاتھ ڈال سکے! جب تک مجھے چاہتے ہو میں تمہاری چاہت کے مزے لُوٹ رہی ہوں۔ مگر جب تم نکاح کا حربہ لے کر میری طرف بڑھتے ہو، تو زمین پر حقارت کے ساتھ تُھوک کر آگے بڑھ جاتی ہوں ——— تم اور تمہارا نکاح کا پیغام! محبت کا دعویٰ کرتے ہو اور نکاح کا پیغام دیتے ہو! محبت کو نکاح سے کیا واسطہ؟ کہہ دینا ——— اُس نے ہنس کر میر صاحب سے کہا ——— کہ یا تو تم بالکل گدھے ہو یا نہایت چالاک بدمعاش!

۱۵ر دسمبر

گدھے اور بدمعاش کے القابوں سے میری تواضع ہو رہی ہے! وہ کہتی ہے تم تو مذہب کے قایل ہی نہیں پھر میرے اپنے درمیان مذہب کا نام کیوں لیتے ہو، یہ کیا

تماشہ ہے ایک ہی چیز تمہاری رائے میں تمہارے لیے زہر قاتل مگر میرے لیے شہد خالص ہے ——— میں بھی سوچتا ہوں تو بات بے تکی معلوم ہوتی ہے، یہ بات کیا ہے کہ جب لیلیٰ کا قدم درمیان میں آتا ہے میری زندگی کا فلسفہ یکسر درہم وبرہم ہو جاتا ہے۔ یا تو یہ ہے کہ میں ایک مکار مرد کی طرح عورت کے لیے ایک ایسا قانون نافذ کرنا چاہتا ہوں جو مجھ پر کسی طرح عاید نہ ہو سکے، جو آزادیاں اور حقوق اپنے کو دیتا ہوں وہی عورت کو دینا گوارا نہیں کرتا، چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ضابطہ میرا بنایا ہوا ہو! ——— یا تو یہ بات ہے، اور یا یہ ہے کہ میری خواہش نے مجھے اتنا مجبور اور حواس باختہ کر دیا ہے کہ میں ہر صورت سے، خواہ وہ میرے عقاید کے موافق ہو یا منافی اس عورت کو اپنا بنا لینا چاہتا ہوں لیکن وہ تو میری دلیلوں اور میری منطق کی کمزوریوں کو دیکھ رہی ہے، عروؔ چاہتا ہے کہ عورت کو اس کی بھی اجازت نہ دی جائے!! جب "عیش" کی حالت میں ہوتا ہوں تو کہتا ہوں کہ زندگی یہی ہے، لیکن جب عشق کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کہتا ہوں، میرا کوئی اصول نہیں، میرا کوئی عقیدہ نہیں، اس لیے کہ میں عاشق ہوں!! وہ ہنستی ہے اور میرا منہ چڑا دیتی ہے، میں "عشق سے

خفا ہو کہ پھر "عیاشی" کرنے لگتا ہوں اور "عیش" کو خوش کرنے کے لیے دنیوی زندگی کے تمام سنجیدہ اُصولوں پر لات مارتا ہوں، مگر "عیش" جب تھکا دیتا ہے تو پھر "عشق" مسلط ہو جاتا ہے، پھر میں نئی نئی بحثیں اور نئے نئے مسئلے پیدا کرتا ہوں کہ اپنے گھوڑوں کو "عشق" کے میدان میں دوڑاتا ہوں، وہ ہنس ہنس کر تالیاں بجاتی ہے، میں رو رو کر سینہ پیٹتا ہوں! کبھی کوئی دوست کہتا ہے، ایک ارادہ کر لو، میں بھی کہتا ہوں کہ ایک ارادہ کیوں نہ کر لوں ——— یا اِدھر یا اُدھر ——— لیکن "ارادہ" کے نام سے "عیش" بھی ناخوش ہوتا ہے اور "عشق" بھی، وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس جنس کا گذر نہیں! "ارادہ" جب تک ساتھ ہوگا ہماری بارگاہ میں گھسنے نہ پاؤ گے۔ اِن دو دیوتاؤں کے درمیان میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہوں ——— ایک دریا کا دھارا ہے کہ مجھے بہائے لیے جا رہا ہے، پہاڑیوں کی وادیوں میں، میدانوں اور صحراؤں کے سینہ پر، جنگلوں اور نخلستانوں کے سایہ میں اور تپتے ہوئے بیابانوں میں! کب تک یہ حال رہے گا، کہاں لے جا کر یہ دھارا مجھے سمندر کی سطح پر ٹپکے گا؟ ——— سوچتا ہوں، پھر اپنے سے بگڑتا

ہوں کہ سوچا کیوں، پھر سوچتا ہوں! عیش، عیش، عشق، ______ ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ پیدا ہوتا، ان دونوں سے الگ کوئی دروازہ کھلتا!! کبھی کبھی مجھے فرنگی شاعر کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں :۔

اندھیری رات میں بچہ روتا ہے ______ روشنی کے لیے!!

۱۹ر دسمبر

اختر کہتا ہے، گھر چلو، اپنی عقل درست کرو، دماغ کے جو "پیچ" ڈھیلے ہو گئے ہیں ان کو پھر تھوڑا کس دو! عورت کے لیے بے قرار ہونا مرد کی مردانگی سے بعید ہے، شیر اگر بکری کے عشق میں بیٹھ کر رویا کرے تو فاقے کرتے کرتے مر جائے!! ______ شیر اور بکری کی مثال دل پر چبھتی ہے۔ کہتا ہوں کہ لاؤ "لیلیٰ" کے دروازہ کے سامنے ہی عورت کی ساری نسل کو ذلیل کروں اور کہوں کہ دیکھ! او سنگدل بے مروّت! مرد ایسے ہوتے ہیں!! ______ دوسرے ہی لمحہ میں یہ سب ارادے ہوا ہو جاتے ہیں ______ لمبا لمبا لیٹ جاتا ہوں۔ اختر پھر دن بھر کچھ کہے دیتا ہے! ______

______ رات اختر ایک بنارسی سمات کو

کہیں سے پکڑ لایا، بہت شوخ و طرار، زبان قینچی، آنکھیں بجلی، ہاتھ پاؤں چنچل، بھویں تنی ہوئی ـــــ وہ تو آکر بچھیل پڑیں۔ کبھی وہ میری گود میں، کبھی میں اُن کی گود میں۔ ظالم نے اس قدر پلائی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ آدھی رات گذر گئی، مجھے ہوش نہ تھا کہ کہاں ہوں! ہزاروں قصے، ہزاروں داستانیں، حُسن کی کارفرمائیاں، عشق کی فتحمندیاں سب ہی کچھ کہا اور سُنا گیا۔ اُس نے اپنے عاشقوں کے قصے سُنائے، میں نے اپنے معشوقوں کے افسانے، کہنے لگی، بتاؤ تم نے سب سے زیادہ کس کو چاہا، میں نے کہا "لیلیٰ" کو ـــــ مگر اب اُس سے نفرت ہے! کہنے لگی! اگر نفرت ہے تو تم جھوٹے ہو تم نے چاہا ہی نہیں!! میں نے کہا۔ چاہا تو ایسا کہ کوئی کیا چاہے گا، مگر اُس نے قدر نہ کی ـــــ کہنے لگی وہ تمھیں پہچان گئی ـــــ خالی ڈھول کو ہر عورت پہچان لیتی ہے ـــــ میں نے کہا ـــــ کم ظرف ہے، وہ کہنے لگی، کم ظرف وہ نہیں تم ہو ـــــ اس کے آئینہ میں تم نے اپنی صورت دیکھ لی ـــــ غرض بات بڑھتی گئی ـــــ

شراب کا دور چلتا گیا، بات بڑھتی گئی ـــــ میں نے کہا میں اُسے جلانا چاہتا ہوں، ذلیل کرنا چاہتا ہوں، دکھا دینا

چاہتا ہوں کہ اُس سے زیادہ حسین عورتیں مجھے نصیب ہیں ــــــــــــ میں نے کہا، چل ذرا "لیلیٰ" کے گھر چلیں، تُو ذرا اُس سے دو باتیں کر اور میں ذرا اپنے کلیجہ کے پھالے پھوڑوں ــــــــــــ میں سمجھتا تھا وہ راضی نہ ہوگی، مگر وہ تو راضی ہوگئی! ہم دونوں اُسی وقت "لیلیٰ" کے گھر پہنچے، مشکل سے دروازہ کھلوایا، بستر پر لیٹ چکی تھی، مجھے دیکھ کر اُٹھ بیٹھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر بنارسی مسمات کو آگے بڑھایا ــــــــــــ "معاف کرنا "لیلیٰ"، ہم اور یہ ہوا خوری کے لیے نکلے تھے، جی چاہا کہ تم سے بھی ملتے چلیں" ــــــــــــ وہ مسکرائی: "تشریف رکھیے، چشم ما روشن ــــــــــــ آدھی رات کی ٹھنڈی ہوا کچھ میرے لیے بھی لائے ہوتے ــــــــــــ بہت حبس ہے"! دونوں کا تعارف کرا کے میں تو فرش پر لیٹ گیا ــــــــــــ دیکھوں یہ دونوں تیتریاں کس طرح ایک دوسرے پر حملے کرتی ہیں ــــــــــــ "لیلیٰ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اس کے چہرہ پر میری اس عجیب حرکت کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا، اس کے لبوں پر وہ لازوال تبسم جو میں نے کسی دوسرے کے لبوں پر آج تک نہیں دیکھا، بدستور موجود تھا، آنکھوں میں ایک قہقہہ جھوم رہا تھا، لہجہ میں شرارت تھی، جو

اثر میں پیدا کرنا چاہتا تھا اس کا ہلکا سا ہلکا عکس بھی نمایاں نہ ہوا۔ میں نے مایوس ہوکر آنکھیں بند کرلیں!——

——تمھیں نیند آرہی ہے، سو جاؤ، میں دوسرے کمرہ میں آرام کرلوں گی۔ یہ کہہ کر اُس نے میرے شانہ پر ہاتھ رکھ دیا، نشہ میرا تیز تھا، اس ہاتھ سے نکل کر بجلی کی ایک رَو جسم میں دوڑی

——مَیں نے کہا، نہیں میں جاؤں گا، کھڑا ہوگیا، ٹانگوں نے سہارا نہ دیا، پھر بیٹھ گیا——"لیلیٰ" نے کہا "اب تم دونوں کو نہ جانے دونگی میرا بستر خوش قسمتی سے آج خالی ہے

——وہ مُسکرائی——تم دونوں آرام کرو——

——اس کے بعد، کچھ میں نے کہا——یاد نہیں کیا کہا،——کچھ اُس نے کہا، یاد نہیں کیا کہا——

——صبح آنکھ کھُلی تو میں نے اپنے کو اس کے بستر پر پایا، میرے پہلو میں وہ بنارسی مسمات سو رہی تھیں، اُن کے مُنہ کی بھاپ میرے رخساروں سے ٹکرا ٹکرا کر سارے کمرہ کو گرم کر رہی تھی

——گھبرا کر اُٹھ بیٹھا

"لیلیٰ!"——"لیلیٰ!" اختر نے کمرہ کا دروازہ کھولا۔

——"کہاں ہے" ؟ میں نے سوال کیا۔ اختر نے کہا "وہ تو چلی گئیں! صبح میرے یہاں آنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھیں، ایک

ملازم اور کچھ سامان باقی ہے، ملازم کہتا ہے کہ بمبئی گئیں ——— خدا ہی جانے! ——— تمہارے نام یہ ایک پرچہ لکھ کر دے گئی ہیں، ———
لکھا تھا:- " رات کا کھیل بھونڈا تھا، مگر میں خوش ہوں! اپنی زندگی کی شعریت کو فنا نہ ہونے دو، کھیلے جاؤ! زندگی کے اس چٹان پر زمانہ کے طوفانوں کی کچھ پروا نہ کرو، جھولوں میں جھولو، باغوں میں کھیلو، اور کبھی سوچو مت! جب تک نہ سوچوگے جب ہی تک آزاد رہوگے، سوچنا موت کا پیام ہے، کچھ مت سوچو! یہ وہ نسخہ ہے جو میں خود بھی استعمال کرتی ہوں ——— بس توکل سے پہلے ارادہ کر چکی تھی، بنارس جانا ضرور تھا، تمہاری نیند کو خراب کرنا مناسب نہ سمجھا ——— یہ دُنیا بہت تنگ ہے، اس لیے یقیناً کسی دن پھر ہم تم ملیں گے ——— گُم نہیں ہوسکتے ——— خدا حافظ!

خاتمۂ کلام

رات مَیں نے اُس کو قتل کر ڈالا تھا!
وہی جو میرے اندر بیٹھا رہا کرتا تھا ——
وہ جو مجھے ڈراتا تھا، دھمکاتا تھا ——
وہ جو ہر وقت میرے دل کو کریدتا رہتا تھا
کبھی کہتا تھا یہ نہ کیجیو، یہ گناہ ہے
کبھی کہتا تھا یہ کرو، یہ ثواب ہے
کبھی کہتا تھا، تو دوزخ میں جائے گا۔
کبھی کہتا تھا، تو جنّت کے قابل بن جا!
وہ جو میرے عیش کو چٹکیاں لیکر پراگندہ کرتا تھا
وہ جو سوئیاں چبھو کر، مجھے بے چین کرتا رہتا تھا
کبھی جنّت، یاد دلاتا تھا کبھی دوزخ ——
کبھی روح اور خدا اور موت کے افسانے سناتا تھا

محض کہانیاں، ——جھوٹی! داستانیں، ——لغو! حکایتیں، ——
بے معنی!!

رات مَیں نے اس بے تمیز کو قتل کر ڈالا!!
اور مَیں مطمئن ہو کر سو گیا——

صبح میں نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا۔ یہ سمجھ کر کہ مقتول کی جگہ خالی ہو گی۔
لو! وہ تو پھر وہاں موجود تھا! —— وہی کمبخت!!——
——اُس نے کہا، گدھے! تو ہر رات مجھے قتل کرے گا،
مَیں ہر صبح زندہ ہو کر اپنے مسکن میں آ بیٹھوں گا——
ہر روز، ہر صبح تو مجھے یہیں پائے گا جہاں ہوں——
مہذب، متمدن، —— جانور!"——

اب کوئی مجھے بتائے میں کیا کروں؟؟
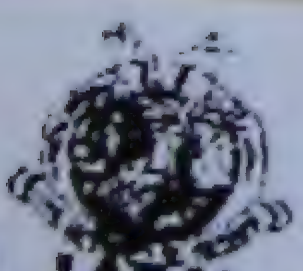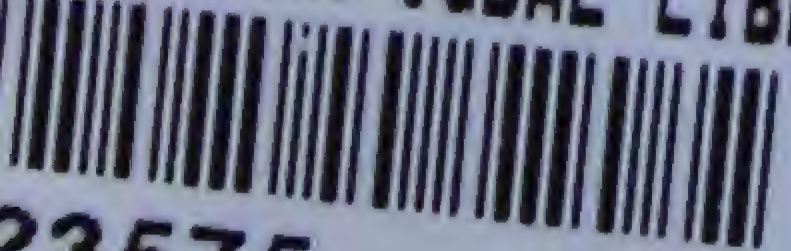
مطبوعات

عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد دکن

	قیمت
۱۔ سادہ و رنگین افسانے۔ ظفر قریشی	عہ/
۲۔ خانقاہ۔ ایم اسلم	عہ/ ۱۲
۳۔ کنول۔ اعظم کریوی	عہ/ ۱۲
۴۔ لیلیٰ کے خطوط (مصور اور اضافہ) قاضی عبدالغفار ..	عہ/ ۱۲
۵۔ کارخانہ۔ فضل الرحمن	۱۲/
۶۔ لہو ترنگ۔ سکندر علی وجد .. اول ۱ے؍ دوم ۲ے	
۷۔ مرمر اور خون۔ عزیز احمد	عہ/
۸۔ کلیات حسرت۔ حسرت موہانی	۸ے/
۹۔ تسنیم۔ قیسی رامپوری	للعہ
۱۰۔ جنگ کیوں ہوئی۔ رحمن بخش	عہ/ ۴

قیمت

۱۱- مضامین فرحت - مرزا فرحت اللہ بیگ.. دوم سے/۸ انتظام سے/۸

۱۲- نوک جھونک - کوثر چاندپوری .. .. عہ/ ۱۲

۱۳- مسکراتے آنسو - بھارت چند کھنہ .. .. عہ/ ۱۲

۱۴- لینن گراڈ تا سمرقند - عشرت صدیقی .. .. .. عہ/

۱۵- بچوں کی کتابیں (بارہ کتابوں کا پہلا سیٹ) شجاع احمد قائد.. للہ/

۱۶- بچوں کی کتابیں (دس کتابوں کا دوسرا سیٹ) کوثر چاندپوری مسلم ضیائی للعہ/

۱۷- بچوں کے خطوط (اول-دوم) مولوی عبدالحق .. عہ/

۱۸- آسان تاریخ اسلام - ادارہ .. .. .. عاں ۴/

۱۹- انتقادیات (اول-دوم) نیاز فتح پوری لعہ

۲۰- نئے پرانے - سہیل عظیم آبادی .. .. .. عاں ۱۲/

۲۱- افسانچے - برج موہن دتاتریہ کیفی .. .. .. عاں ۱۲/

۲۱- پرانے خدا - کرشن چندر .. .. عاں ۱۲/

۲۱- ایک نواب صاحب کی ڈائری - مرزا فرحت اللہ بیگ سے ۱۲/

۲- نقش امروز - علی اشرف .. .. .. عاں

۲- لیڈی ڈاکٹر حلیمہ خانم - حسن الدین خاموش.. .. مے ۱۲/

۲- پاک بیبیاں - اعجاز الحق قدوسی .. .. .. عاں ۴/

مطبوعات

دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن

زیرِ طبع کتابیں

عبد الحق اکیڈیمی

حیدر آباد دکن

۳۸۔ کلیاتِ فانی .. .. فانی بدایونی .. ..

۳۹۔ یادِ ایام .. .. مولوی عبد الرزاق کانپوری ..

۴۰۔ مقالات .. .. مولوی عبد الحق .. .. ..

۴۱۔ نقش فرہنگ .. .. قاضی عبد الغفار .. .. ..

۴۲۔ نئی بیماری .. .. مہندر ناتھ .. .. ..

۴۳۔ مقدس چرخہ .. حسن الدین خاموش .. ..

۴۴۔ ہمارے کارخانے .. منظور الحسن ہاشمی .. ..

۴۵۔ طوفان .. .. .. نثار احمد

زیر طبع کتابیں

دارالاشاعت سیاسیہ حیدرآباد دکن

۴۶۔ سفرنامۂ بلادِ اسلامیہ .. بہادر یار جنگ علیہ الرحمۃ
۴۷۔ تقاریر بہادر یار جنگؒ .. ادارہ .. .. ..
۴۸۔ سوانح بہادر یار جنگؒ .. ادارہ .. .. ..
۴۹۔ خطبات بہادر یار جنگؒ .. ادارہ .. .. ..
۵۰۔ قرآنی تصورِ مملکت .. .. شاہد حسین رزاقی ..
۵۱۔ پولٹیکل ڈکشنری .. .. عبدالقدوس ہاشمی ..
۵۲۔ دساتیر عالم .. .. .. شاہد حسین رزاقی ..

ملنے کا پتہ

کتاب خانہ انجمن ترقی اردو (ہند) عابڈ روڈ حیدرآباد دکن